معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے — فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک — بیس پونڈ — یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک — سات پونڈ — یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔ حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج، اسٹریچن روڈ، کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

رسالہ ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

فہرست

مضمون نگاران معارف

۱۶۰ ویں جلد

ماہ جولائی ۱۹۹۷ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

ماہ جولائی سنہ ۱۹۹۷ء تا ماہ دسمبر سنہ ۱۹۹۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۶۰ ماہ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۹۷ء عدد ۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

لکھنؤ ادبی و تہذیبی امتیاز اور دوسری گوناگوں خوبیوں اور خصوصیتوں کے لیے مشہور تھا، لیکن اب یہی شہرۂ آفاق شہر شیعہ اور سنی جھگڑے کے لیے بدنام ہے، یہاں ایک عرصہ تک نوابانِ اودھ کی حکومت رہی جو شیعہ تھے ان ہی کے زمانے میں عزاداری کے جلوس نکلنا شروع ہوئے مگر کبھی سنی شیعہ جھگڑا نہیں ہوا، اس کا سلسلہ انگریزوں کے دور میں اس وقت شروع ہوا جب تبرا بازی عزاداری کا جزءِ اعظم بنا۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریسی حکومت قائم ہوئی اور پنڈت گوبند ولبھ پنت نے شیعوں کی شدید مخالفت کے باوجود سنیوں کو مدحِ صحابہ کا جلوس نکالنے کی اجازت دیدی، اس سے تصادم اور ٹکراؤ کی مستقل بنیاد پڑ گئی، آخر ماتم و عزا کے جلوس کے لیے تبرا بازی کیوں لازمی قرار دیدی گئی، کیا دنیا کے کسی مذہب کی بھی یہ تعلیم ہے کہ دوسرے فرقہ و مذہب کے مقدس لوگوں پر علی الاعلان سب و شتم کرکے اس کی دل آزاری کی جائے، قرآن مجید تو مشرکین اور انکے معبودوں کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کرتا ہے کہ مبادا وہ لوگ اللہ تعالیٰ ہی کو برا بھلا نہ کہنے لگیں، اگر عزاداری کا جلوس نکالنا شیعی نقطۂ نظر سے ضروری بھی ہو تو اس کو تبرا بازی سے پاک ہونا چاہیے تاکہ دوسرے فرقہ میں خواہ مخواہ اشتعال اور ہیجان نہ برپا ہو۔

دوسری طرف مدحِ صحابہ کا جلوس بھی دین و ایمان کا ضروری تقاضا تو نہیں ہے، جب عید میلاد النبی کے جلوس اور جشن کو اس لیے بدعت قرار دیا جاتا ہے کہ اس کا عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں کوئی وجود نہیں تھا تو سوال یہ ہے کہ کیا خیر القرون میں مدحِ صحابہ کے جلوس نکالے جاتے تھے؟ آخر مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق ضروری ہے یا مدحِ صحابہ اور تبرا بازی کا جلوس، کیا شریعتِ بیضا نے یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ ایذا اور دل آزاری حرام ہے اور کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نہیں فرمایا ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں۔ کیا آپ نے پڑوسیوں بلکہ عام انسانوں کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید نہیں کی ہے، کیا یہ سب ہدایات صرف وعظ و ارشاد کے جلسوں ہی میں بیان کرنے

کے لیے ہیں یا عمل کرنے کے لیے بھی ہیں، اگر عمل کرنے کے لیے ہیں تو مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں کے افراد ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہیں۔

گزشتہ بیس برسوں سے حکومت نے دونوں فرقوں کے جلوس پر پابندی عائد کر رکھی ہے، اس کی وجہ سے فساد اور خون خرابہ نہیں ہو رہا تھا مگر یہ صورت نہ ہمارے خاموش نہ رہنے والے جوانوں کو پسند تھی اور نہ انکے دوست نما دشمنوں کو، چنانچہ اس ہجری سال کے آغاز ہی میں پرجوش شیعی نوجوانوں نے اس پابندی کو مداخلت فی الدین کہہ کر حکومت سے اسے ختم کرنے کا مطالبہ کیا اور حکومت کے انکار پر احتجاج اور دوسرے ناروا طریقے اختیار کیے، یہاں تک کہ بعض نوجوانوں نے خود سوزی بھی کی۔ اس پر بھی اکتفا نہ کرکے مشتعل اور بپھرے ہوئے جوانوں نے چہلم کے روز جلوس نکالنا طے کیا، جس کے پیشِ نظر حکومت نے غیر معینہ مدت کا کرفیو لگا دیا مگر اس کے باوجود وہ مانے اور اخباری رپورٹ کے مطابق دس ہزار کا جلوس سڑکوں پر آگیا اور تشدد، توڑ پھوڑ، آتش زنی اور اشتعال انگیزی کرنے لگا، پولیس نے لاٹھی چارج کی جس میں پچاس سے زیادہ آدمی زخمی اور ایک ہزار گرفتار ہوئے اور بھاری مالی نقصان ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ مڈبھیڑ پولیس اور انتظامیہ ہی سے رہی اور شیعہ سنی تصادم نہیں ہوا جب کہ اشتعال اور نفرت کا پورا سامان موجود تھا اور سنی بھی جوش میں بپھرے ہوئے تھے اور پولیس بھی اسے شیعہ سنی جھگڑے کا رنگ دینا چاہتی تھی غرض جو کچھ بھی ہوا اور جو ہو رہا ہے وہ بڑا افسوسناک اور سخت قابلِ مذمت ہے۔

کہا جا رہا ہے کہ اترپردیش کی حکومت نے معاملات کو سلجھانے میں بے تدبیری اور کوتاہی کی۔ وہ بے جا سختی بھی کر رہی ہے اور جس طرح ایسے موقعوں پر حزبِ مخالف کے لوگ اختلافات کو ہوا دے کر سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، کہا جا رہا ہے کہ اس مسئلہ کو بھی انہوں نے پیچیدہ اور پرپیچ بنا کر دونوں فرقوں کے نوجوانوں کو تشدد اور اشتعال پر آمادہ کیا اور نفرت کے جذبات بھڑکائے ہیں، یہ امکانات اگر درست بھی ہوں تو بھی دونوں فرقوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ

وہ کیوں دوسروں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں، ان کو دوسروں کو کچھ کہنے کے بجائے خود اپنے گریبانوں میں منھ ڈال کر سوچنا چاہیے کہ ان جھگڑوں سے کس کا زیاں ہو رہا ہے اور کس کی ہوا خیزی ہو رہی ہے کس کی امت کا شیرازہ درہم برہم ہو رہا ہے، کیا اس بے جا مذہبی جنون اور جوش کا مظاہرہ کرکے وہ خدا اور رسول کے احکام کی خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں، کیا یہی وقت انکے لڑنے بھڑنے کا ہے جب اقوام عالم ان پر پل پڑی ہیں، ہندو احیائیت پسندی ان کا بھارتیہ کرن کر رہی ہے صیہونیت کا سیلاب ان کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جانا چاہتا ہے اور سرمایہ داری کا نہ ڈوبنے والا سفینہ ان کو غرق کر دینے پر لگا ہوا ہے جس کی تباہ کاریاں اور چیرہ دستیاں عالم اسلام کو تہ و بالا کیے ہوئے ہیں۔ جس کے فتنے یم بہ یم، دریا بہ دریا جو بجو ہیں، جس نے مرکز اسلام کو بھی بے دست و پا کر دیا ہے اور دور جانے کی کیا ضرورت؟ پاکستان میں شیعہ سنی اختلافات اور آئے دن کے قتل عام کے پردہ زنگاری میں بھی تو یہی معشوق ہے۔

اگر ایسے حالات میں بھی مسلمان متحد نہ ہوئے اور شیعہ سنی جھگڑے ہوتے رہے اور خود سنی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا اختلاف بڑھتا رہا تو اس سے مسلمان کمزور پسپا اور بالکل ہی بے دم ہو جائیں گے اور دشمنان اسلام اس سے فائدہ اٹھا کر انکا استحصال کرتے رہیں گے، شیعہ اور سنی دونوں کے سنجیدہ، متین اور ذمہ دار لوگوں کو مسئلہ کی سنگینی اور اس کی نزاکت کو اس کے وسیع پس منظر میں سمجھ کر دونوں فرقوں میں اتحاد و اتفاق کے نقطے تلاش کرنا چاہیے تاکہ انکی جو قوت برادر کشی اور اپنے ہی زیاں میں صرف ہو رہی ہے وہ دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے مقابلہ میں صرف ہو، کیا پورے ملک میں دونوں فرقوں میں چند نفوس بھی ایسے نہیں ہیں جو انہیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی سے باز رکھیں، لکھنؤ کی پیچیدہ صورت اور شیعہ سنی کشمکش کو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا ہے دونوں فرقوں کو خود مل جل کر اس کا حل ڈھونڈھنا ہوگا، چاہے اس کے لیے ایک دو بار نہیں دسیوں بار مل بیٹھنا پڑے اس وقت ملت کا اتحاد اہم فرض ہے اور شیعہ سنی نزاع کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دینا سب سے مبارک اور مقدس کام ہے۔

اٹھو ورنہ حشر نہ ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

مقالات

علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کے امتیازی پہلو

از پروفیسر ریاض الرحمن شروانی، علی گڑھ

(۲)

ان اختلافات کے علاوہ کیا اسباب تھے جن کی بنیاد پر علامہ شبلی نے علی گڑھ سے ملازمت کا رشتہ منقطع کیا، اس موقع پر ان کی تفصیلات میرے نزدیک غیر ضروری ہیں، کیونکہ اس طرح کی مزاجی اور انتظامی کش مکش بہت سوں کو بہت سے اداروں میں پیش آتی رہی ہے جس کے نتیجے میں بعض اوقات انہیں سبکدوشی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ تاہم یہ امر قابل لحاظ ہے کہ علامہ شبلی کا علی گڑھ سے مکمل منصبی قطع تعلق ۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات کے بعد ہی ہوا۔ علی گڑھ چھوڑنے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے وابستہ ہو جانے کے بعد ایک اور موقع ایسا آیا جب یہ اختلاف ابھر کر سامنے آیا اور یہ حیات جاوید کی اشاعت کا موقع تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں بیان کیا ہے کہ سرسید کی نظر انتخاب اپنی سوانح عمری لکھانے کے لیے سب سے پہلے علامہ شبلی ہی پر پڑی تھی لیکن مندرجہ بالا اختلافات کی بنا پر وہ اس تجویز کو بالطائف الحیل ٹال گئے اور بالآخر یہ خدمت خواجہ الطاف حسین حالیؒ نے انجام دی۔ حیات جاوید سرسید کی زندگی اور کارناموں کی ایک مکمل دستاویز ہے اور بعد میں ان پر کام کرنے والوں کے لیے بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس پر علامہ شبلی کو اعتراض تھا کہ اس میں مدلل مداحی پائی جاتی ہے اور سرسید کی کمزوریوں کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ ہمارے بزرگوں کا ہمیشہ یہ شیوہ

رہا ہے اور آج بھی ہے کہ وہ جن اکابر سے عقیدت رکھتے ہیں جب ان پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی شخصیت کے روشن پہلوؤں ہی کو اجاگر کرتے ہیں اور اگر ان میں کچھ داغ دھبے ہوتے ہیں تو ان سے صرف نظر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ حیات جاوید کے بعد لکھی جانے والی بیشتر سوانح عمریوں، یہانتک کہ خود حیات شبلی اور بعد ازاں حیات سلیمان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ علامہ شبلی کے قائم کردہ معیار پر کم سے کم ہمارے قدیم خیال کے بزرگوں کی تحریر کردہ سوانح عمریوں میں شاید ہی کوئی سوانح عمری پوری اتر سکے۔ حیات جاوید پر علامہ شبلی کے تبصرے سے بھی زیادہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کا تبصرہ متنازعہ فیہ قرار پایا۔ مولانا شروانی نے اپنے اس تفصیلی تبصرے میں جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ۱۹۰۲ء میں شایع ہوا۔ خواجہ حالی اور ان کے اس کارنامے کی دل کھول کر داد دی ہے بلکہ یہانتک لکھ دیا ہے کہ "اگر کوئی شخص دنیا میں بڑے بڑے کام کر کے اس شوق میں جان دیدے کہ اس کو ایسا بیاگرافر ملے گا جیسا سرسید کو ملا تو ہمارے خیال میں یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ اس نے سستا سودا خریدا"[۳۲] البتہ جہاں انہیں حیات جاوید میں سرسید کے مذہبی خیالات کی تائید و حمایت نظر آئی اس پر انہوں نے سخت تعریض کی ہے، نیز یہ اعتراض کیا ہے کہ حیات جاوید کریٹیسزم سے خالی ہے۔[۳۳] ظاہر ہے اس معاملے میں وہ اور علامہ شبلی ہم خیال تھے لیکن شیخ محمد اکرام کا یادگار شبلی میں یہ کہنا کہ مولانا شروانی نے یہ تبصرہ علامہ شبلی سے متاثر ہو کر لکھا تھا ہمارے خیال سے درست نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر شیخ صاحب کی عبارت سے تو شبہ ہوتا ہے کہ دراصل اس تبصرے کے پیچھے علامہ شبلی کا ذہن ہی کارفرما تھا۔[۳۴] ہمارے اکابر کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار عموماً اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ ان خیالات کا اظہار کرنے والے اہل قلم ان اکابر کے مزاج و عادات سے واقف

نہیں ہوتے ہیں ورنہ جو شخص مولانا شروانی کے مزاج و کردار سے تھوڑی سی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف کسی کے اثر سے کچھ کہنے یا کرنے کے روادار ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا شروانی مرحوم پر اپنے فاضلانہ مضمون مطبوعہ معارف اعظم گڈھ بابت دسمبر ۱۹۵۰ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک ایسے جلسے کی روداد لکھتے ہوئے جس میں علامہ شبلی اور ان کے مخالفین میں اختلاف رائے کے بسبب بدمزگی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا مولانا شروانی کی غیر جانبداری کا جو دلکش نقشہ کھینچا ہے وہ ہماری اس رائے کی پوری طرح توثیق کرتا ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے، اس مسئلے کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے معروف جریدے لسان الصدق کی ۲۰ فروری ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں مولانا شروانی کے اس تبصرے سے شدید اختلاف کیا تھا۔ اس وقت تک وہ سرسید کی فکر سے پوری طرح متاثر تھے اور نہ ان کا علامہ شبلی سے رابطہ قائم ہوا تھا اور نہ مولانا شروانی سے تعلقات استوار ہوئے تھے۔ یہاں یہ ذکر بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ علی گڑھ سے منصبی تعلق ختم ہو جانے کے باوجود جب نواب محسن الملک کی ایم۔ اے۔ او کالج اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی سکریٹری شپ کے دوران سر آغا خاں کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا غلغلہ بلند ہوا تو علامہ شبلی نے قلمے اور قدمے دونوں طرح اس کی تائید کی اور مسلم یونیورسٹی فاونڈیشن کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔[۳۵]

تحریک ندوۃ العلماء سے علامہ شبلی نعمانی کا قریبی تعلق ابتدا ہی سے پایا جاتا ہے۔ اس کے پہلے اجلاس منعقدہ کانپور اپریل ۱۸۹۴ء میں وہ نہ صرف شریک تھے بلکہ اس کی کارروائی میں انہوں نے عملی حصہ لیا تھا۔ بعد کے کئی اجلاسوں میں بھی وہ پابندی

سے شریک ہوتے رہے اور ان میں ان کی کارکردگی نمایاں رہی۔ حکومت وقت کی ندوۃ العلماء سے بدگمانی اور اس بدگمانی کو رفع کرنے کی مساعی کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی نے ندوۃ العلماء کے پانچویں اجلاس منعقدہ کانپور ۱۸۹۸ء کے تناظر میں کیا ہے۔[6] گویا سرکار انگلشیہ کی اس بدگمانی اس کے قیام کے ابتدائی برسوں ہی میں شروع ہو گئی تھی اور اس کا سبب ماسوا اس کے کچھ نہ تھا کہ انگریزی حکام ہندوستانیوں کی بالعموم اور ہندی مسلمانوں کی بالخصوص کسی ایسی تنظیم کو (خواہ اس کی نوعیت علمی یا تعلیمی ہی کیوں نہ ہوتی) پنپتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تھے جس میں ان کی اجتماعیت کے جراثیم انہیں خوردبین سے بھی نظر آنے لگتے تھے۔ موجودہ صدی کے دوسرے دہے میں جب ایم۔ اے۔ او کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی تجویز زیر غور تھی اور ہمدردان و معاونین کالج چاہتے تھے کہ اسے مسلمانوں کے دوسرے کالجوں کے الحاق کا حق حاصل ہو تو برسر اقتدار انگریز اسی بنا پر اس کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے کہ اس طرح علی گڑھ کو مسلمانوں میں مرکزیت حاصل ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ ندوۃ العلماء کے اس وقت کے اکابر نے انگریزوں کی غلط فہمی دور کرنا مناسب سمجھا کیونکہ جیسا کہ عرض کیا گیا کوئی ادارہ چلانے کے لیے حکومت وقت کی غلط فہمی اور بدگمانی دور کرنی ہی پڑتی ہے۔ ۱۸۹۷ء ہی سے علامہ شبلی ایم۔ اے۔ او کالج سے دوری اختیار کرنے کی تدابیر سوچ رہے تھے اور اس کے لیے بعض اقدامات بھی کیے تھے۔ ہمارے خیال سے ندوۃ العلماء سے وابستگی کا تصور ان کے ذہن میں اسی وقت سے تھا اگرچہ انہیں اس کا اندیشہ بھی تھا کہ ان کی اور ان کی پیش کردہ تجاویز کی پذیرائی شاید وہاں ان کے حسب منشا نہیں ہوگی۔ اسی دوران انہوں نے ندوہ کے چند سالانہ اجلاسوں میں شرکت بھی نہیں فرمائی۔ حیات شبلی کی شہادت ہے کہ انہوں نے گونڈہ سے ۱۸۹۹ء میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ

"اگر آپ یا ارکان (ندوہ) مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں تو بتائیں کہ میں کیا کام کروں۔ میری جو تجاویز ہیں وہاں چلنے نہ پائیں گی۔"[7] درمیان میں علامہ کا تعلق ریاست حیدرآباد سے رہا لیکن ہم جس زاویۂ نگاہ سے ان کی شخصیت کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں اس میں تعلق حیدرآباد کی چنداں اہمیت نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت علی گڑھ کے تعلق کی ہے اور پھر ندوۃ العلماء کے تعلق کی۔ علی گڑھ اور ندوہ کی یہ تقدیم و تاخیر زمانی اعتبار سے ہے اہمیت کے اعتبار سے نہیں ہے۔ ندوۃ العلماء میں ان کی توجہ کا مرکز سب سے پہلے اور سب سے زیادہ نصاب تعلیم کی تعیین و ترمیم کا مسئلہ رہا اور یہی بعض دوسرے علماء سے ان کے اختلاف رائے کا اصلی سبب ہوا۔ اس مقصد سے ندوہ میں ۱۹۰۲ء میں جو مجلس مقرر ہوئی تھی اس کے معتمد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے لیکن علامہ کا نام اس کے اراکین کی فہرست میں شامل نہیں تھا۔[8] چنانچہ انہوں نے ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھا "آپ لوگ ایسا ڈرتے ہیں کہ میں شریک ہوا اور میں نے مذہب کو اور طرز تعلیم کو الٹ دیا۔"[9] مولانا شروانی ان سے ندوہ سے اپنا تعلق برقرار رکھنے اور اس کے معاملات میں عملی دلچسپی لینے کے لیے برابر اصرار کرتے رہے چنانچہ وہ اسی سال ندوہ کے سالانہ اجلاس منعقدہ امرتسر میں شریک ہوئے اور نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اپنی رجز خوانی اور گوہر افشانی سے حاضرین جلسہ کی عقیدت و شیفتگی کا مرکز بنے۔[10] اگرچہ درس نظامی میں تبدیلی اس موقع پر منظور کر لی گئی لیکن اس کا نفاذ نہیں ہو سکا۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ بعض امور بھی مختلف فیہ اور تصفیہ طلب تھے۔ اس بارے میں علامہ شبلی کے مولانا شروانی کے نام خطوط کا لہجہ خاصہ تلخ ہے۔[11] ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہو کر انہوں نے مستقل لکھنؤ میں قیام فرمایا اور ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم منتخب ہوئے۔[12] گویا اب ان کا ندوہ سے منصبی تعلق قائم ہو گیا اور خدمت دین

وملت کا ایک وسیع میدان انہیں میسر آگیا۔ جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے تحریر فرمایا ہے: "دار العلوم کے قائم کرنے کا اصلی مقصد عربی طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم میں اصلاح کرنا تھا[۱۳] اور علامہ شبلی سب سے زیادہ اہمیت اسے ہی دیتے تھے۔ وہ ان علوم کی جگہ جو بالذات مقصود نہیں بلکہ مقصود اعلیٰ کے حصول کا ذریعہ ہیں، مثلاً صرف ونحو اور منطق وفلسفہ، ان علوم کو نصاب میں زیادہ رائج کرنے کے قائل وحامی تھے جو مقصود بالذات ہیں یعنی ادب، دینی علوم اور علم عقائد۔ مختلف علوم میں بعض کتابوں کی تبدیلی بھی پیش نظر تھی اور اسی کے ساتھ انگریزی زبان کی نصاب میں شمولیت اور جو طلبہ اس میں امتیاز حاصل کرنا چاہیں انکے لیے عربی تعلیم سے فراغت کے بعد دو برس خالص انگریزی تعلیم کا درجۂ تکمیل[۱۴]۔

عربی مدارس کے نصاب میں انگریزی زبان کی شمولیت ایک ایسا مسئلہ ہے جو میرے نزدیک آج تک پوری طرح حل نہیں ہوا ہے۔ چونکہ اتفاق سے میرا پیشہ یونیورسٹی میں عربی کی تدریس رہا ہے اور میرا سابقہ عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ سے مسلسل رہا ہے اور آج بھی کسی نہ کسی نوعیت سے ہے، اس لیے میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر عرض کر سکتا ہوں کہ بالعموم انگریزی میں ان کی صلاحیت برائے نام ہوتی ہے اور اس سے وہ فوائد حاصل نہیں ہو رہے ہیں جو علامہ شبلی نعمانی اور ان کے یا بعد کے دور کے بعض دیگر علماء کے پیش نظر تھے یعنی ملک اور بیرون ملک اسلام کی تبلیغ، معترضین اسلام کا ان ہی کی زبان میں جواب اور تحقیق وتفحص میں انگریزی کی کتابوں سے بھرپور استفادہ۔ مختلف زبانوں کے ادب کا تقابلی مطالعہ اس کی ایک اور شق ہے اور اس کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ایسے کئی ندوی بزرگوں کے نام لکھے ہیں (اور ان میں خود ان کا نام نامی بھی شامل ہے) جنھوں نے انگریزی سے اپنی واقفیت حاصل کر لی تھی کہ وہ بعض

اہم علمی وملی خدمات انجام دے سکے۔ حیات شبلی غالباً ۱۹۴۳ء میں شایع ہوئی تھی۔ ۱۹۴۳ء اور ۱۹۹۷ء کی درمیانی مدت میں اور بھی کئی ایسے ناموں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سب مستثنیات ہیں، یہاں گفتگو عام طلبہ سے ہو رہی تھی۔ موجودہ دور میں انگریزی کے ساتھ ہندی سے اچھی واقفیت بھی ضروری ہو گئی ہے۔ ہمیں علامہ شبلی نعمانی کی فراست، دور بینی اور اصابت رائے کا اعتراف کرنا چاہیے کہ انھوں نے وقت کے تقاضے کو سمجھا تھا اور اس پر عمل درآمد کے لیے بے چین تھے اگرچہ شاید دیگر علماء کے رجحان طبع کا لحاظ رکھتے ہوئے انھوں نے اس میں اتنی ترمیم فرما دی تھی کہ "حالانکہ تمام طالب علموں کو انگریزی پڑھانا مقصود نہیں، نہ یہ میرا خیال ہے۔ صرف اس قدر مقصود ہے کہ دو چار لڑکے انگریزی بھی پڑھیں"[۱۵]۔ ظاہر ہے کہ دو چار لڑکوں کا انگریزی پڑھنا کافی نہیں تھا بلکہ اس کے جزو نصاب ہونے کا سوال تھا۔ ان کی اس ذہنی تربیت میں علی گڑھ کا یقیناً اثر تھا۔ اس معاملے میں انہیں مولانا سید عبد الحیٔ سے بھی شکایت تھی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی سے بھی کیا یہ امر موجب حیرت نہیں ہے۔ علامہ شبلی انگریزی کو ندوۃ العلماء کی نصاب میں شامل کرانا چاہتے تھے اور مولانا شروانی کو، جن کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے بالکل درست لکھا ہے کہ سر سید تحریک کے پرانے حامی تھے[۱۶]، اس میں تذبذب تھا۔ مولانا شروانی نے خود علامہ شبلی سے فرمایا کہ ان کے تذبذب کا سبب علامہ کی بدنامی کا ڈر تھا[۱۷]۔ آج جب کہ بیسویں صدی آخری سانسیں لے رہی ہے، ممکن ہے یہ ڈر عجیب محسوس ہو لیکن اس صدی کے آغاز میں اتنا بے بنیاد نہیں تھا کیونکہ یہ علماء بقول مولانا سید سلیمان ندوی "ان اثرات سے ڈرتے تھے جو اس زبان کے ساتھ نادانستہ طور پر عربی کے طالب علموں میں سرایت کریں گے"[۱۸]۔ تاہم علامہ شبلی کو اپنی بدنامی کی پرواہ نہیں تھی اور وہ اپنی رائے پر اٹل تھے۔ میری ناچیز رائے میں

آج اس ساری بحث کا پیش منظر تبدیل ہو گیا ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بغیر انگریزی پڑھے ہوئے یا بہت کم انگریزی پڑھ کر بھی مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات کی اچھی خاصی تعداد ایسی ہے جو ان اثرات سے بچی ہوئی نہیں ہے جن کے ان میں سرایت کر جانے کا اندیشہ ہمارے قدیم علماء کو تھا۔[1]

علامہ شبلی کے ذہن میں ندوۃ العلماء سے ایک ایسے علمی رسالے کے اجراء کا خیال جو اسکے شایان شان ہو، دو تین سال قبل سے جاگزیں تھا۔ ان کے نزدیک اس کا اصلی مقصد "طلبائے دار العلوم کی ذہنی تربیت"[19] تھا۔ رسالے کا اجرا طے ہوا لیکن اس کی ادارت کیلئے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کا نام تجویز ہوا۔ مولانا شروانی کی خود خواہش تھی کہ یہ ذمہ داری علامہ شبلی کو سونپی جائے کیونکہ ان کے نزدیک وہی اس کے سب سے زیادہ اہل تھے۔ خود علامہ کی [illegible] بھی یہی تھی کیونکہ وہ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ اس کام کو سب سے بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔ انھیں شبہ تھا کہ ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری اس منصب کے لیے ان کا نام پسند نہیں کریں گے۔ بہر حال ۱۹۰۳ء میں علامہ رسالہ "الندوہ" کے مدیر مقرر ہو گئے[20]۔ کافی غور و خوض کے بعد اس کا نظم اس طرح قرار پایا کہ دو ایڈیٹر مقرر ہوئے، علامہ شبلی اور مولانا شروانی۔ اس وقت علامہ شبلی حیدر آباد میں رہ رہے تھے۔

---

[1] **معارف:** فاضل مقالہ نگار کا تجزیہ درست ہے اور یہ قوم کی بدنصیبی ہے کہ اب تک عربی مدارس کے طلبہ کو اور جدید تعلیم گاہوں کے فضلا کو عربی جیسی آنی چاہیے نہ آئی لیکن اس کی وجہ سے اسکی ضرورت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے، معیار تو وہی ہونا چاہیے جو علامہ چاہتے تھے کیونکہ تقاضائے وقت یہی ہے۔ اب تو مستثنیٰ افراد بھی نہیں پیدا ہو رہے ہیں جو قدیم و جدید علوم کے واقف کار ہوں، جس کی شدید ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے عملاً نہ ہونے سے ضرورت تو ختم نہیں ہو سکتی۔

اور مولانا شروانی حبیب گنج ضلع علی گڑھ میں۔ مقام اشاعت شاہجہاں پور تھا کیونکہ مددگار ناظم مولانا سید عبدالحئی کا قیام ان دنوں وہاں تھا۔ چھپائی کا انتظام مطبع مفید عام آگرہ میں تھا۔ اس کی لوح پر درج ہوتا تھا کہ اس کا مقصد "علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ" تھا۔ اس کا اجراء اگست ۱۹۰۴ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ سے ہوا[21]۔ ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی کے لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد "الندوہ" کی اشاعت کا یہ انتشار دور ہوا۔ اس نے جلدی ہی علمی حلقوں میں اعتماد و افتخار پیدا کر لیا۔ علامہ شبلی اور مولانا شروانی کے علاوہ اس کے حلقہ ادارت میں یکے بعد دیگرے مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد اللہ العمادی اور مولانا عبدالسلام ندوی شامل رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۲ء تک چلتا رہا۔ اس سال باہمی اختلافات کی بنا پر اس کا دور اول جو علامہ شبلی سے منسوب تھا اختتام کو پہونچا۔ اگرچہ "الندوہ" ۱۹۱۶ء تک جاری رہا لیکن ۱۹۱۲ء کے بعد علامہ شبلی سے اس کا تعلق نہیں رہا۔ اس آٹھ سال کی مدت میں اس میں متعدد گرانقدر مضامین شائع ہوئے جو مختلف اہل علم کے زور قلم کا نتیجہ تھے لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس کی روح رواں علامہ شبلی ہی تھے اور زیادہ تر مضامین ان ہی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے[22]۔ الندوہ کی اشاعت کی یہ تفصیل اس لیے گوش گزار کی گئی کہ علامہ نے ندوۃ العلماء کی ترقی اور فروغ کے سلسلے میں جو خواب دیکھے تھے اور جنھیں بروئے کار لانے کی کوشش کی تھی ان میں اصلاح نصاب کے بعد ان کے منصوبے کا سب سے اہم جز ندوۃ العلماء کے آرگن کے ذریعہ اعلیٰ لٹریچر کی افزائش اور اردو داں طبقے میں اس ذوق کی آبیاری تھا۔ اس طرح وہ مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرانا چاہتے تھے اور خود ان میں تحقیق و تفحص کا جذبہ بحال کرنے کے خواہشمند

تھے۔ یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ جب اکابر ندوۃ العلماء نے اس کا اجرا منظور کیا تو پہلے انکے بجائے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو اس کا مدیر مقرر کیا اور جب ادارت ان کے سپرد بھی کی تو مولانا شروانی کا نام بہرحال ان کے ساتھ وابستہ رکھا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان بزرگوں کو علامہ شبلی کے مقابلے میں مولانا شروانی کے اعتدال و توازن فکر پر زیادہ اعتماد تھا۔

علامہ شبلی نعمانی کے بعض دیگر بزرگان ندوۃ العلماء سے انتظامی امور یا ایسے ہی دوسرے مسائل میں جو اختلافات تھے ان سے ہم اسی طرح صرفِ نظر کریں گے جس طرح علی گڑھ کے تعلق سے کیا ہے۔ کیونکہ یہاں ہمارا مقصد علامہ کی علمی، مذہبی یا سیاسی فکر کے تناظر میں ایک طرف جدید اور دوسری طرف قدیم خیالات کے حامل حضرات سے انکے اختلاف رائے کی نشاندہی کرنی ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس کشمکش کے نتیجے میں علامہ کی شخصیت کا جو نقش ابھرتا ہے وہ کتنا روشن، تابناک اور دل افروز اور جان فزا ہے۔ بہرحال ان اختلافات کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ علامہ نے جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوۃ العلماء کی معتمدی سے استعفیٰ دیدیا[۲۳]۔ اگرچہ ندوۃ العلماء اور وہاں کے طلبہ سے ان کا قلبی تعلق برابر قائم رہا۔ بعد میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کی بنا پر طلبہ نے ایک عظیم الشان اسٹرائک کیا۔ اس اسٹرائک کی حمایت میں اردو کا قومی دہلی پریس پیش پیش تھا۔ بعض حضرات جن میں حکیم محمد اجمل خاں اور مولانا محمد علی کے نام سب سے نمایاں ہیں، درمیان میں پڑے اور مصالحت ہوئی لیکن اس مصالحت سے پہلے علامہ شبلی نعمانی کی وفات ہو چکی تھی[۲۴]۔

علامہ شبلی کے کئی اور اہم کارنامے ہیں جن میں ہمارے نزدیک وقف علی الاولاد اور اشاعت اسلام کے مسائل سے متعلق ان کی مساعی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور ان سے

ان کے جذبۂ ایمانی پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی اصلاح کی انہیں کتنی فکر تھی۔ تاہم یہ امور ایسے ہیں جو جداگانہ مطالعے کا موضوع ہیں اور مختصر وقت میں ان پر تفصیلی گفتگو ممکن نہیں ہے۔

آخر زمانۂ حیات میں انہوں نے جن کاموں میں خصوصی دلچسپی لی ان میں اعظم گڑھ نیشنل اسکول جو اب شبلی ڈگری کالج کے نام سے معروف ہے، ان کی توجہ کا خاص مرکز تھا۔ اس اسکول سے انہیں ابتدا ہی سے بہت تعلق خاطر تھا لیکن اپنی دوسری مصروفیات کے پیش نظر اس کے کاموں میں عملی حصہ لینے سے معذور تھے۔ اب موقع ملا تو ادھر توجہ فرمائی۔ یہ اسکول مختلف مدارج سے گزر کر اپنی موجودہ حیثیت تک پہنچا ہے۔ کاش اہل اعظم گڈھ کی خصوصاً اور اگر مسلمانان ہند کی نہیں تو مسلمانان یو۔ پی کی عموماً جد و جہد سے یہ ادارہ صحیح معنی میں علامہ شبلی کی شایان شان یادگار بن جائے۔ بلا شبہ اس وقت ان کی سب سے عظیم یادگار دار المصنفین ہے۔ دار المصنفین کے قیام کا تخیل بھی ان کے ذہن میں مدت سے تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی شہادت کے مطابق یہ تجویز سب سے پہلے ۱۹۱۰ء میں کتبخانہ ندوۃ العلماء جو اب ان کے نام نامی سے منسوب ہے، کی عمارت کے سلسلے میں انہوں نے پیش کی تھی۔ اس تخیل میں بنیادی اہمیت "ایک قومی کتب خانۂ اعظم" کی تھی جسے مرکز بنا کر تصنیف و تالیف کا کام لیا جائے۔ اس وقت اس منصوبے کی تکمیل کے لیے ان کے ذہن میں ندوۃ العلماء ہی کا نام تھا[۲۵]۔ لیکن ندوہ کے باہمی اختلافات کی بنا پر یہ منصوبہ برگ و بار نہیں لا سکا اور ۱۹۱۴ء میں جو ان کا سال وفات ہے، الہلال کلکتہ کے ذریعہ یہ تجویز ملک کے سامنے پیش کی[۲۶]۔ دار المصنفین کی ہیئت ترکیبی اور اس کی جائے وقوع کے سلسلے میں مختلف تجاویز سامنے آئیں۔ بالآخر فیصلہ اعظم گڈھ کے حق میں ہوا جہاں اس کے لیے علامہ نے اپنے قریبی

اعزہ سے اجازت لے کر اپنی خاندانی جائداد وقف فرمائی[27] اس منصوبے کو بروئے کار لانے کی مساعی کے ساتھ ساتھ سیرت النبی کی تصنیف میں بھی برابر انہماک رہا اور ابھی دونوں کام نامکمل تھے کہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو پیغام قضا آگیا[28]۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ ان دونوں کاموں کی تکمیل ان کے شاگرد رشید اور وقت کے فاضل اجل مولانا سید سلیمان ندوی کے لیے مقدر تھی اور سید صاحب نے ان کی جس طرح تکمیل فرمائی اس سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں۔

مندرجۂ بالا معروضات کی روشنی میں علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور کارناموں کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ مختلف الابعاد اور کثیر الجہات ہے۔ اس میں اسلام کی سربلندی، ملت کی دردمندی، قوم و وطن کی خیرخواہی، علمی اشتغال، ادبی حسن و زیبائی، علمی اور انتظامی صلاحیت ان سب رنگوں کی ایسی آمیزش ہے کہ اس نے اسے بہت جاندار اور جاذب نظر بنا دیا ہے۔ ان کے یہاں سیکھنے کا جو جذبہ تھا اور وہ خذ ما صفی ودع ما کدر کے اصول پر جس حد تک کاربند تھے اس کی نظیر ان کے معاصرین میں ملنی دشوار ہے، ان کی نظر مستقبل پر تھی لیکن ان کی جڑیں ماضی میں پیوست تھیں اور وہ حال کے تقاضوں سے بے خبر نہیں تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اپنی ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے طفیل وہ ماضی کے تابندہ نقوش سے حال کو منور کرنا چاہتے تھے اور اس کی روشنی مستقبل تک پہنچانے کی تدبیریں سوچتے اور حتی الامکان ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے رہتے تھے، اس جدوجہد میں ان کا تصادم ان لوگوں سے بھی ہوا جو حال اور مستقبل کو ماضی کی گرفت سے آزاد کرانا چاہتے تھے اور ان لوگوں سے بھی جو ماضی کی حکمرانی ہر صورت اور ہر حال قائم رکھنا چاہتے تھے، میرے نزدیک یہ تصادم ہی علامہ شبلی نعمانی

کی شخصیت اور کارناموں کو عظمت عطا کرنے کا موجب ہوا۔

حواشی

[1] حیات شبلی: ۲۹۱-۹۲ [2] مقالات شروانی: ۴۷و۴۸ [3] ایضاً: ۶۱ [4] یادگارِ شبلی: ۲۳۹ [5] حیات شبلی: ۵۳-۳۵ [6] ایضاً: ۳۱۶ [7] ایضاً: ۳۴۶-۴۷ [8] ایضاً: ۳۸۷ [9] ایضاً: ۳۸۸ [10] ایضاً: ۳۸۹-۹۰ [11] ایضاً: ۳۹۲-۹۶ [12] ایضاً: ۴۱۲ [13] ایضاً: [14] یہ بحث حیات شبلی کے متعدد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور کئی مقامات پر اس کا اعادہ ہوا ہے [15] حیات شبلی: ۲۱۴ [16] ایضاً: ۲۹۸ [17] ایضاً: ۲۱۴ [18] ایضاً: ۴۲۰ [19] ایضاً: ۴۳۷ [20] ایضاً: ۴۳۷-۳۹ [21] ایضاً: ۴۳۹-۴۰ [22] ایضاً: ۴۴۳-۴۶ [23] ایضاً: ۶۴۸ [24] ایضاً: ۶۵۳-۶۰ [25] ایضاً: ۶۸۸ [26] ایضاً: ۶۹۲ [27] ایضاً: ۶۹۵ [28] ایضاً: ۷۲۳۔

نور محمدی اور حدیث جابرؓ

از ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی، کراچی

عام لوگوں میں مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نور محمدی کی تخلیق کی اور اس کے بعد اسی سے ساری کائنات بلکہ نعوذ باللہ، اپنا عرش و کرسی تک پیدا کیا۔ افسوس ہے کہ کتب میلاد یا سیرت نبوی پر لکھی گئی بعض متاخر کتابوں میں مذکور بعض روایات کی وجہ سے یہ خیال اس قدر عام ہوا کہ بعض محترم و مقدس سیرت نگاروں نے بھی بغیر کسی تحقیق کے اس روایت کو اپنی کتابوں میں شامل کر لیا ہے، مذکورہ حدیث کا پہلا ٹکڑا یہ ہے کہ "اللہ نے جو چیز سب سے پہلے پیدا کی وہ میرا نور تھا"۔ لیکن اس طویل حدیث میں جو کچھ مذکور ہے اور جس کو ہم آگے بیان کریں گے وہ ہماری عام کتابوں میں نہیں پایا جاتا، ہندوستان میں درود شریف اور سیرت نبوی پر ایک تازہ کتاب صل علیٰ محمدؐ کے نام سے چھپی ہے، اس میں یہ پوری حدیث موجود ہے۔ آیندہ صفحات میں اس کا محققانہ جائزہ لینا مقصود ہے۔

یہ حدیث کافی طویل ہے، مشہور صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے تخلیق کائنات کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اول ما خلق اللہ، نور نبیک یا جابرؓ" اے جابر! سب سے پہلے جو چیز اللہ نے پیدا فرمائی وہ تمہارے نبی کا نور تھا۔ پھر حدیث کا تکملہ اس طرح ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں سے

پہلے اپنے نور سے تمہارے نبی کا نور پیدا کیا پھر اس کو جہاں چاہا پھیلا دیا، اس وقت نہ تو لوح تھا نہ قلم، نہ جنت نہ جہنم، نہ فرشتہ نہ آسمان نہ زمین تھا نہ سورج نہ چاند، نہ جن نہ انس۔ پھر جب اللہ کی مشیئت ہوئی کہ مخلوق کو پیدا کرے تو اس نے اس نور کو چار اجزاء میں تقسیم کر دیا۔ پہلے جزء سے قلم پیدا کیا۔ دوسرے جزء سے لوح، تیسرے سے عرش، پھر چوتھے جزء کو چار مزید اجزاء میں تقسیم کر دیا اور اس کے پہلے جزء سے حاملین عرش کو پیدا کیا، دوسرے جزء سے کرسی اور تیسرے سے باقی فرشتے پیدا کیے اور چوتھے جزء کو پھر سے بارہ چار اجزاء میں تقسیم کر دیا اور اب اس کے پہلے جزء سے آسمان پیدا کیے دوسرے جزء سے زمین، تیسرے سے جنت اور جہنم پیدا کیے پھر چوتھے جزء کو مزید چار اجزاء میں تقسیم کر دیا اور اس نئی تقسیم میں پہلے جزء سے مومنین کی آنکھوں کا نور پیدا کیا، دوسرے جزء سے ان کے دلوں میں نور پیدا کیا جو اللہ کی معرفت ہے اور تیسرے جزء سے ان کے انس کا نور پیدا کیا جو توحید ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔"

حدیث کے یہ الفاظ قسطلانی کی کتاب مواہب لدنیہ[1] میں مذکور ہیں، انہوں نے حدیث کو عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی الیمنی (م ۲۱۱ھ) سے منسوب کیا ہے۔ جنہوں نے اپنی سند سے اسے مصنف میں روایت کیا ہے۔

ایک ترکی مصنف علاء الدین علی دوا السکتواری نے بھی اپنی کتاب "محاضرۃ الاوائل و مسامرۃ الاواخر" (ص ۲۱) میں یہ حدیث ذکر کی ہے جو ۹۹۸ ہجری میں تصنیف کی گئی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کتاب اور مواہب لدنیہ میں مذکور حدیث کے الفاظ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ "صل علیٰ محمدؐ" کے مصنف کے سامنے علی دوا السکتواری

---

[1] المواہب اللدنیہ (شرح الزرقانی علی المواہب) ج ۱، ص ۴۶۔

کی بھی عربی کتاب یا اس کا ترجمہ تھا جس پر اعتماد کرکے انہوں نے اس حدیث کو مستند
باور کرلیا ہے اور غالب خیال یہ ہے کہ سیرت نبوی کی بعض اردو کتابوں میں بھی یہی الفاظ
زیادہ متداول و رائج ہیں جن کو اوپر ہم بڑی حد تک مختلف اور اضافہ شدہ بتا چکے ہیں
ملاحظہ ہو؟ "اے جابر! سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کا نور پیدا کیا، اس کے بعد
اسی سے ہر اچھی چیز پیدا کی۔ اس کے بعد تمام چیزیں پیدا کیں اور جب اس نور کو پیدا کیا
تو اس کو اللہ تعالیٰ نے اس نور کو پیدا کرنے کے بعد بارہ سال تک اپنے مقام قرب میں
رکھا پھر اس کی چار قسمیں کیں، ایک قسم سے عرش پیدا کیا اور دوسری قسم سے کرسی کو،
تیسری سے حاملین عرش کو اور چوتھی قسم سے کرسی سنبھالنے والے اور انتظام کرنے والے
فرشتوں کو پیدا کیا اور چوتھی قسم کو بارہ سال تک مقام محبت میں رکھنے کے بعد اسکے
چار حصے بنائے، ایک حصے میں قلم پیدا کیا، دوسرے سے لوح، تیسرے سے جنت
اور چوتھے حصے کو بارہ سال تک مقام خوف میں رکھا پھر اس کو چار اجزاء میں تقسیم کیا،
ایک جزء سے فرشتے پیدا کیے، ایک سے سورج اور چاند اور تیسرے سے ستارے
اور چوتھے جزء کو بارہ سال تک مقام رجاء (امید) میں رکھا، پھر اس سے چار اجزاء
تخلیق کیے، پہلے جزء سے عقل تخلیق کی، دوسرے سے علم اور حلم، تیسرے سے پاکیزگی
اور توفیق اور چوتھے حصے کو بارہ سال تک مقام حیاء میں رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے
اس کی طرف دیکھا تو اس نور (میرے نور سے) پسینہ ٹپکنے لگا اور اس سے ایک لاکھ
چوبیس ہزار قطرے ٹپکے پھر اللہ نے ہر قطرے سے ایک نبی اور رسول کی روح پیدا کی
اس کے بعد ان انبیاء کی روحیں سانس لینے لگیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی سانسوں سے
اولیاء، نیک بختوں اور شہداء اور اطاعت شعار مومنین کی روحوں کا نور پیدا کیا۔

روز قیامت تک کے لیے۔ اس طرح عرش اور کرسی میرے نور سے ہیں۔ ملائکہ مقربین اور
روحانیین میرے نور سے ہیں اور ساتوں آسمان کے فرشتے میرے نور سے ہیں۔ جنت
اور اس میں جو کچھ نعمتیں ہیں وہ میرے نور سے ہیں۔ سورج چاند ستارے میرے نور
سے ہیں۔ عقل، علم اور توفیق خداوندی میرے نور سے ہیں۔ انبیاء اور رسولوں اور شہداء
اور صالحین اور خوش نصیبوں کی روحیں میرے نور سے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بارہ ہزار
حجاب (پردے) تخلیق کیے اور میرے نور (جو چوتھا جزء ہے) اس کو ہر پردے
میں ایک ہزار سال رکھا اور یہ مقامات عبودیت ہیں، یہ بارہ پردے اس طرح ہیں:
حجاب کرامت، حجاب سعادت، حجاب ہیبت، حجاب رحمت، حجاب رافت،
حجاب علم، حجاب حلم، حجاب وقار، حجاب سکینت، حجاب صبر، حجاب صدق اور حجاب
یقین، پھر اس نور نے ہر ایک حجاب میں ایک ہزار سال اللہ کی عبادت کی پھر جب
ان تمام پردوں سے میرا نور نکلا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مٹی سے مرکب کیا اور اس سے
مشرق و مغرب اس طرح روشن ہو گئے جیسے چراغ سے اندھیری رات روشن ہو جاتی ہے
پھر اللہ تعالیٰ نے زمین سے آدمؑ کو پیدا کیا اور ان کی پیشانی میں یہ نور رکھ دیا پھر ان سے
یہ حضرت شیث کو منتقل ہوا۔ پھر یہ نور برابر طاہر سے طیب اور طیب سے طاہر
کو منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن المطلب کی پشت میں منتقل ہوا اور اس سے
میری والدہ کے رحم میں منتقل ہوا، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا میں نکالا اور مجھے سید المرسلین
خاتم النبین، رحمۃ للعالمین اور قائد المحجلین (یہ نور پیشانی والوں کے سردار) بنا کر بھیجا۔
اے جابر۔ اس طرح تمہارے نبی کی تخلیق ہوئی....

آگے ہم اس حدیث کو روایت و درایت کے اصول پر جانچنے کی کوشش کریں گے۔

نقد حدیث از روئے اصول حدیث:

حقیقت یہ ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے منسوب یہ حدیث نہ تو صحاح ستہ میں وارد ہے اور نہ حضرت جابر بن عبداللہ کی جمع کردہ اس مجموعۂ احادیث میں شامل ہے جو مسند جابر کے نام سے حدیث نبوی کی عظیم و ضخیم قدیم کتاب مسند امام احمد بن حنبل کا جزء ہے، علاوہ ازیں بعد کے جمع کردہ مجموعۂ احادیث میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا، جیسے امام سیوطی کی جمع الجوامع اور علی المتقی ہندی کی کنز العمال وغیرہ میں۔

اوپر عرض کیا گیا تھا کہ سب سے پہلے دسویں صدی ہجری کے مصری مصنف قسطلانی (م ۹۲۳ھ) نے اپنی سیرت نبوی المواہب اللدنیہ میں اس حدیث کو عبدالرزاق ابن ہمام الیمنی (م ۲۱۱ھ) کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ جس کو المواہب کے حوالے سے بعد کے عرب اور غیر عرب مصنفین نے کتب سیرت میں درج کیا ہے۔ عرب مصنفین میں شیخ اسماعیل عجلونی (م ۱۱۶۲ھ) نے اپنی کتاب "کشف الخفاء ومزیل الالباس عما اشتہر من الاحادیث علی السنۃ الناس" (ج ۱/ ص ۲۶۵-۲۶۶) میں قسطلانی ہی کے الفاظ میں ان کی روایت لکھی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب مدارج النبوۃ کی جلد اول میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی کتاب نشر الطیب فی ذکر الحبیب میں اس حدیث کے ابتدائی ٹکڑے کا مختصر ذکر کیا ہے۔

اس طرح جو حدیث نہ تو قدیم کتب سیرت میں موجود تھی اور نہ معتبر مجموعہ ہائے حدیث میں، وہ قسطلانی کے بیان کے بعد دور آخر کے مصنفین کی کتابوں میں راہ پاگئی ہے۔ اور افسوس ہے کہ ان حضرات نے اس کی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

سطور بالا میں ہم نے حدیث زیر بحث کے دو نمونے پیش کیے ہیں ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ نئی تصنیف "اللہم صلی علی محمد" میں حبیب البشر خیری صاحب کی نقل کردہ روایت قسطلانی کی بیان کردہ حدیث سے بالکل مختلف اور ترکی کے دسویں صدی ہجری کے ایک عام مصنف علی ددہ السکتواری کی کتاب کے مطابق ہے جس کے اندر بارہ بارہ ہزار سال نور محمدی کو مختلف مقامات: مقام قرب، مقام محبت، مقام خوف وغیرہ میں رکھنے پھر نور محمدی سے جو پسینے کے قطرے ٹپکے تو اس سے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی و رسول پیدا کیے جانے وغیرہ کا ذکر ہے، لیکن ہزاروں سال کے اس لمبے چوڑے حساب کا تذکرہ اس روایت میں نہیں ہے جو قسطلانی نے المواہب اللدنیہ میں مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے لکھی ہے۔ ذیل میں دونوں مصنفین کی روایتوں پر الگ الگ بحث و کلام کیا جاتا ہے:

(الف) پہلے المواہب اللدنیہ کی روایت کو لیجیے، جس کو بعض ثقہ و معتبر مصنفین نے بھی نقل کیا ہے اور جس کے لیے قسطلانی نے مصنف عبدالرزاق کا حوالہ دیا ہے حالانکہ یہ حدیث مصنف میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قسطلانی کا ایک سہو ہے، کیونکہ اگر یہ حدیث مصنف عبدالرزاق کے کسی دوسرے نسخہ میں ہوتی تو امام سیوطی اور علی المتقی الھندی وغیرہ اس کو اپنے مجموعہ ہائے احادیث میں ضرور ذکر کرتے۔

یہاں قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اپنے ماخذ پر کلام کرتے ہوئے المواہب اللدنیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں موجود ہیں[1] اس طرح مغرب اقصیٰ کے مشہور

---

[1] شبلی نعمانی، سیرت النبی، ج ۱ ص ۳۷، دار الاشاعت کراچی ۱۹۸۵

مصنف علامہ عبدالحئی کتانی نے اپنی کتاب التراتیب الاداریہ کے مقدمہ (۲۳) میں قسطلانی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ انھوں نے اس کتاب کو قاضی عیاض کی کتاب الشفاء کے مطابق مرتب کیا ہے بلکہ خطبہ میں بھی انہی کا اتباع کیا ہے[1]، اس طرح یہ حدیث روایتاً ثابت نہیں، اب رہی درایت تو اس کی رو سے بھی یہ حدیث قابل قبول نہیں ہوسکتی کہ اس میں چار چار مرتبہ جن تقسیمات کا ذکر ہے اور اس بات کی صراحت کہ عرش وکرسی بھی نور محمدی سے پیدا کیے گئے ہیں وہ قرآن وحدیث کے بیانات کے بالکل خلاف ہے، جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

(ب) یہ حدیث نور محمدی کی وہ روایت ہے جو ہم کو دسویں صدی ہجری کے بعد کے ثقہ سنی مصنفین کی کتابوں میں ملتی ہے لیکن جہاں تک اس کی اس روایت کا تعلق ہے جو عوام میں زیادہ متداول ومقبول ہے تو وہ وہی ہے جو "اللھم صلے علی محمد" کے مصنف نے اختیار کی ہے اور جس کا حوالہ ہم ترکی مصنف علی ودّا کی کتاب سے دے چکے ہیں تو یہ روایت درحقیقت ایک شیعی مصنف ملا محمد معین کاشفی فراہی المعروف بملا مسکین (م ۹۰۷ھ) کی کتاب "معارج النبوۃ ومدارج الفتوۃ" سے منقول ہے، اس کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں بھی ہوچکا ہے اور تازہ شایع شدہ کتاب "اللھم صلی علی محمد" کے مصنف نے راقم الحروف کو اپنے ایک خط میں اس کتاب کے حوالہ سے بلکہ ان دونوں کتابوں کے حوالہ سے آگاہ کیا، کیونکہ موصوف نے اپنی کتاب میں یہ حدیث بغیر کسی حوالے کے ذکر کی ہے اور میرے استفسار پر انھوں نے یہ حوالہ دیا۔

[1] عبدالحئی کتانی، التراتیب الاداریہ، مقدمہ ص ۲۳، دار الکتاب العربی۔

ملا محمد حسین کاشفی ہرات کے رہنے والے تھے، شیعہ مصنفین کے بارے میں مشہور کتاب "الذریعہ الی تصانیف الشیعہ" تصنیف آغا بزرگ تہرانی میں اس کتاب کا ذکر ہے[1]۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ آغا بزرگ تہرانی نے ملا معین کا ذکر کرتے ہوئے ان کو مجنوں بھی لکھا ہے اور یہ کہ وہ ایک ایسے شہر میں رہنے کی وجہ سے جہاں سنیوں کی اکثریت تھی (یعنی ہرات) تقیہ کرتے تھے۔ آغا بزرگ نے ان کی اور کتابوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں ان کا ایک شعری دیوان بھی ہے، اہم بات یہ ہے کہ آغا بزرگ نے معارج النبوۃ پر جو فارسی زبان میں ہے کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ویظھر من المعارج ھذا انہ عامی یحتمل تقیۃ بمقتضی بلدہ وعصرہ ..."

کتاب معارج النبوۃ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ (ملا معین) عوام میں سے تھے اور اپنے شہر اور زمانے کے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر تقیہ کرتے تھے[2]۔

اس طرح نور محمدی سے متعلق دوسری تفصیلی نام نہاد حدیث جس میں متعدد بار بارہ بارہ ہزار سال نور محمدی کے مختلف مقامات میں رہنے کا ذکر ہے وہ اسی شیعہ مصنف یعنی ملا مسکین (معین کاشفی) کی پیش کردہ روایت ہے جس کو ترکی کے مصنف علی ودّہ نے اس کتاب سے نقل کیا اور وہ حدیث اس طرح عام ہوگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ نور محمدی سے متعلق احادیث شیعی مصنفین ہی کی اختراع کردہ ہیں

[1] آغا بزرگ تہرانی، الذریعہ الی تصانیف الشیعہ۔ ج ۹ ص ۱۰۰۸، [2] ایضاً ج ۲۱ ص ۱۸۴۔

اس ضمن میں مشہور شیعی مصنف ملا محمد باقر مجلسی (م ۱۱۱۱ھ) کی کتاب بحار الانوار ج ۱۵ قابل ذکر ہے جو حضورؐ کی سیرت سے متعلق ہے اور اس کا عنوان ہے "تاریخ نبینا"، اسکے ص ۲۳-۲۴ میں نور محمدی سے متعلق چار حدیثیں ۱۴ تا ۴۴ پیش کی گئی ہیں، ان میں پہلی حدیث دوسری صدی ہجری کے مشہور شیعی راوی جابر الجعفی کی ہے جو امام باقر سے مروی ہے اور اس حدیث کا پہلا جملہ "یا جابر" سے شروع ہوتا ہے، اس کا مضمون بھی یہی ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا، انہی کے ساتھ اپنی عظمت کے نور سے اہل بیت کو پیدا کیا۔

اس کتاب کی دوسری حدیث امام احمد بن حنبل سے مروی ہے، لیکن اس میں صحابی کا ذکر نہیں۔ اس میں یہ ہے کہ:

کنت انا وعلی نوراً بین یدی الرحمن قبل ان یخلق عرشه باربعة عشر الف عام۔

میں اور علی اللہ کے سامنے عرش کی تخلیق سے چودہ ہزار برس قبل نور (کی صورت میں) تھے۔

تیسری روایت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے، یعنی حضرت جابر بن عبد اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ:

اول شئی خلقه اللّٰه تعالیٰ ما هو؟ فقال نور نبيك يا جابر خلقه الله ثم خلق منه كل خير۔

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ سب سے پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا تمہارے نبی کا نور اے جابر! اللہ نے اس کو پیدا کیا پھر اس سے ہر چیز پیدا کی۔

چوتھی حدیث ان الفاظ کے ساتھ ہے:

وعن جابر ایضاً قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اول ما خلق الله نوری ابتدعه من نوره واشتقه من جلال عظمته۔

جابر ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی میرا نور ہے، اسے اپنے نور سے تخلیق کیا اور اپنی عظمت کے جلال سے اس کا استخراج کیا۔

قابل ذکر بات یہ ہے ملا باقر مجلسی نے تصریح کی ہے کہ انہوں نے یہ چاروں احادیث ایک مصنف فضل اللہ بن محمود فارسی کی کتاب "ریاض الجنان" سے نقل کی ہیں۔ یہ کتاب ابھی تک مخطوط ہے۔ لیکن اس کے بارے میں آغا بزرگ تہرانی نے اپنی کتاب "الذریعہ الی تصانیف الشیعہ" میں یہ تحریر کیا ہے کہ:

فیه اخبار غریبة فی المناقب۔

اس میں مناقب کے بارے میں بڑی عجیب وغریب باتیں مذکور ہیں۔

آغا بزرگ کے اس بیان سے "ریاض الجنان" میں مذکور نور محمدی سے متعلق احادیث کی حقیقت عیاں ہے کہ وہ ناقابل اعتماد ہیں پھر یہ کہ شیعہ حضرات کی مشہور ترین اور مستند ترین کتاب اصول کافی کی جلد اول کتاب الحجۃ میں ایک حدیث نور محمدی سے متعلق منقول ہے جو صرف اسی قدیم شیعی راوی جابر الجعفی سے مروی ہے جس کا پورا نام

جابر ابن یزید ہے وہ یہ حدیث امام محمد الباقر سے روایت کرتا ہے اور وہ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

یا جابر ان اللہ اول ماخلق	اے جابر اللہ نے سب سے پہلے جو
خلق محمداً وعترتہ الھداۃ	چیز پیدا کی وہ محمد اور ان کے اہل بیت
المھتدین فکانوا اشباح	ہیں جو ہدایت دینے والے اور ہدایت
نور بین یدی اللہ قلت	یافتہ ہیں وہ اللہ کے سامنے نوری اشباح
وما الاشباح؟ قال ظل النور	تھے، میں نے کہا اشباح کا کیا مطلب ہے؟
ابدان نورانیۃ بلا ارواح	فرمایا نور کا سایہ، نورانی جسم بغیر
...... الخ۔	روحوں کے۔

اس کے بعد حدیث میں اہل بیت کے اخلاق، علم و حلم اور عبادات وغیرہ کا ذکر ہے لیکن وہ سب تفصیل ہیں جو ہمیں ملا معین کاشفی کی کتاب "معارج النبوۃ و مدارج الفتوۃ" میں اور اس کے فوراً بعد علی ددہ کی کتاب "محاضرۃ الاوائل" میں ملتی ہے۔

ہماری ذاتی رائے ہے کہ نور محمدی سے متعلق جو حدیث عوام الناس اور بعض اہل سنت مصنفین کے ہاں مشہور ہے اس کا اصل منبع مشہور شیعی راوی جابر بن یزید الجعفی (م ۱۲۸ھ) ہے جس کو کبھی کبھی شیعی کتابوں میں صرف جابر بھی لکھا جاتا ہے اور عام لوگ دھوکہ کھا کر اس سے جابر بن عبد اللہ الانصاری مراد لے لیتے ہیں اور اس نام نہاد مشہور حدیث کا پہلا لفظ بھی جیسا کہ مذکور ہوا "یا جابر" ہے، ہمارا خیال ہے کہ اس لفظ یا جابر سے مراد وہی جابر بن یزید الجعفی ہے جو اہل سنت کی کتابوں میں یا خود شیعہ مصنفین نے جابر بن عبد اللہ بنا دیا ہے۔

مزید برآں کہ خود عبد الرزاق بن ہمام الصنعانی اپنے تشیع کے لیے مشہور ہیں۔ امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ان کی مفصل سوانح "عبد الرزاق بن ہمام الصنعانی الشیعی" کہہ کر شروع کی ہے۔ تاحال ہم کو مصنف عبد الرزاق کے مطبوعہ نسخہ (بیروت ۱۳۹۰ھ و مابعد) میں یہ حدیث نہیں ملی، اگر کسی نسخہ میں پائی بھی جاتی ہو تو اغلب گمان یہ ہے کہ عبد الرزاق نے اس کو جابر الجعفی سے روایت کیا ہوگا۔

ثانیاً جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے اور جس کا حوالہ سب سے زیادہ بنیادی بات ہے اس سے بھی اس نام نہاد حدیث کی تائید ہوتی ہے بلکہ قرآن کریم میں جو کچھ ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ اس نام نہاد حدیث میں تو یہ کہا گیا ہے کہ نعوذ باللہ عرش و کرسی بھی دوسری تمام مخلوقات اور آسمان و زمین کے علاوہ نور محمدی سے پیدا کیے گئے جبکہ قرآن کریم اس کے برخلاف سورۂ ہود میں فرماتا ہے:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	وہی ہے جس نے چھ دن میں آسمان
وَالْاَرْضَ فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ	اور زمین پیدا کیے اور اس کا عرش
وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ (ہود:۷)	پانی پر تھا۔

اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آسمان و زمین اور کسی چیز کی پیدائش سے پہلے عرش الٰہی موجود تھا۔ امام محمد ابن جریر الطبری (م ۳۱۰ھ) نے اپنی مشہور و مستند تفسیر میں وکان عرشہ علی الماء کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے مشہور شاگردوں مجاہد اور قتادہ وغیرہ سے روایت کی ہے کہ اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین یا کوئی چیز بھی پیدا کرے اس کا عرش موجود تھا (تفسیر طبری، آیت ۷ سورۂ ہود)

یہی بات امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھی ہے، صحیح بخاری کی ایک حدیث سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جس کا ذکر ہم آیندہ صفحات میں کریں گے۔

حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں سورۂ ہود کی اس آیت کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ کسی چیز کی پیدائش سے قبل اللہ تعالیٰ کا عرش موجود تھا اور انہوں نے ترمذی اور ابن ماجہ کا حوالہ عرش کی تخلیق کے بارے میں دیا ہے۔ علاوہ ازیں سورۃ القلم کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر اور دوسرے مفسرین حضرت ابن عباسؓ کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ:

اول ما خلق اللہ القلم۔	سب سے پہلے جو چیز اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ قلم ہے۔

اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نور محمدی کو سب سے پہلے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس سے پہلے عرشِ خداوندی یا پھر قلم کو پیدا کیا گیا، بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۱۵ میں جو آخری الفاظ ہیں " قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ " یہاں نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

غالباً سب سے پہلے یہ بات امام محمد ابن جریر الطبری نے اس آیت کی تفسیر میں لکھی ہے مگر یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ تفسیر جو ماثور تفاسیر[1] میں سب سے قدیم ہے اس میں اس آیت کی تفسیر میں کسی صحابی یا تابعی مفسر جیسے مجاہدؒ سعید بن جبیر، قتادہ اور عکرمہ وغیرہ کا کوئی قول نقل نہیں۔ نہ سلف میں سے کسی اور مفسر کا ذکر ہے، حالانکہ طبری کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ صحابہ اور تابعی مفسرین کے اقوال نقل کرنے کے بعد اپنی ترجیح بیان کرتے ہیں یا پھر اپنی تفسیر بیان کرنے کے بعد مفسرین سلف کے اقوال سے اس کی تائید پیش کرتے ہیں،

---

[1] ماثور تفاسیر سے وہ کتب تفسیر مراد ہیں جو صحابہ و تابعین کے اقوال کا مجموعہ ہیں۔

لیکن امام موصوف نے " قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ " کی تفسیر میں نور سے رسولؐ مراد لیتے ہوئے کسی صحابی یا تابعی مفسر کا قول نقل نہیں کیا، اسلیے یہ ان کی ایک ذاتی رائے ہے جس کے لیے کوئی دلیل بھی نہیں دی گئی، لیکن اگر مکمل آیت اور اس کے سیاق و سباق کو مدنظر رکھا جائے تو یہاں لفظ نور سے رسولؐ مراد لینا کسی طرح درست نہیں ہوگا کیونکہ آیت اس طرح شروع ہوتی ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَآءَكُمْ	اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارے
رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا	رسول آگئے جو (تمہاری) کتاب کی بہت
كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتَابِ	سی چیزوں کو وضاحت سے بیان کرتے
وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ قَدْ جَآءَكُمْ	ہیں جن کو تم چھپاتے تھے اور بہت سی
مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ۔	چیزوں سے درگزر کرتے ہیں۔ تمہارے
	پاس اللہ کا نور آگیا ہے اور واضح کتاب
	آگئی ہے۔

غور کیجئے جب آیت کے شروع ہی میں رسولؐ کے آنے کا ذکر کر دیا گیا ہے تو دوبارہ نور کے لفظ سے اس کو دہرانے کی کیا ضرورت تھی پھر یہ کہ دوسری آیت (نمبر ۱۶) کے اندر جو آیت نمبر ۱۵ سے مربوط ہے اس میں ہے کہ " يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ " یعنی اس (قرآن) کے ذریعہ اللہ ہدایت دیتا ہے اب اگر پہلی آیت میں لفظ نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب مبین سے مراد قرآن ہوتا تو عربی قاعدے کی رو سے اس دوسری آیت کے پہلے جملے میں يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ کے بجائے يَهْدِىْ بِهِمَا اللّٰهُ (اللہ ان دونوں کے ذریعہ ہدایت کرتا ہے) ہونا چاہیے تھا۔ یہی بات شیخ رشید رضا نے اس آیت کی تفسیر میں ابنی

تفسیر المنار جلد ۶ ص ۳۰۴ پر لکھی ہے۔

امام رازی نے "قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ" کی تفسیر میں تین اقوال نقل کیے ہیں، پہلا یہ کہ نور سے مراد محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، دوسرا یہ کہ نور سے مراد اسلام اور کتاب سے مراد قرآن ہے۔ تیسرا قول یہ کہ نور اور کتاب دونوں سے مراد قرآن ہے۔ انہوں نے آخری قول کو ضعیف قرار دیا ہے، اس بنا پر کہ واو عطف مغایرت کے لیے ہوتا ہے اس لیے ان کے نزدیک یہی بات درست ہے کہ نور سے محمدؐ اور کتاب سے قرآن مراد ہے۔ لیکن انہوں نے یہاں اس بات سے تغافل برتا کہ واو یہاں عطف بیان کے لیے ہے یعنی واؤ سے لفظ نور کی تفسیر بیان کی گئی ہے، اس طرح اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ آگے خود امام صاحب نے بھی آیت نمبر ۱۶ کے پہلے جملہ "يَهْدِيْ بِهِ" کے معنی قرآن کریم لکھے ہیں جو عربی قواعد کی رو سے اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب نور اور کتاب مبین کو ایک ہی چیز سمجھا جائے اور یہی بات درست ہے، قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

بیسویں صدی عیسوی کے بہت مشہور مصری مفسر شیخ رشید رضا نے اس قرآنی آیت کی تفسیر میں وہی بات لکھی ہے جو ہم نے بیان کی ہے، انہوں نے امام رازی کا نام لیے بغیر قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ میں لفظ نور کے بارے میں تین مختلف اقوال نقل کیے ہیں، اس کو ترجیح دیا ہے کہ نور سے مراد یہاں قرآن کریم ہے گو عطف میں ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے تاہم وہ تفسیر و بیان کے لیے بھی آتا ہے۔ ثانیا یہ کہ لفظ "یھدی بہ" سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے، ورنہ "يَهْدِيْ بِهٖ" کی بجائے یہاں "يَهْدِيْ بِهِمَا" ہوتا، ثالثاً یہ کہ قرآن مجید کے لیے لفظ نور متعدد آیات میں

آیا ہے مثلاً: فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (اعراف: ۱۵۷) دوسری جگہ ہے فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا (التغابن: ۸)

غرض قرآن شریف کی اس آیت سے نور محمدی مراد لینا درست نہیں۔ ثالثاً: جہاں تک احادیث نبویہ کا تعلق ہے تو ان میں بھی کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جو چیز پیدا کی وہ نور محمدی تھا بلکہ اس کے برخلاف صحیح احادیث میں یہ ملتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا کی وہ عرش الٰہی تھا یا یہ کہ عرش الٰہی ذات الٰہی کے ساتھ موجود تھا، اور سب سے پہلے جو چیز اللہ نے تخلیق کی وہ قلم تھا، صحیح بخاری کی کتاب التوحید میں حضرت عمران بن حصین سے ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

كان الله ولم يكن شيئ قبله	اللہ تعالیٰ موجود تھا اور اس سے پہلے
وكان عرشه على الماء ثم	کوئی چیز موجود نہ تھی اور اس کا عرش
خلق السموات والارض۔	پانی پر تھا پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کیے۔

ترمذی میں حضرت ابو رزینؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عرش کو پیدا کیا۔ (باب التفسیر۔ تفسیر سورۂ ہود) امام ترمذی نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے یہ مرفوع حدیث بھی روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلی چیز جو اللہ نے تخلیق فرمائی وہ قلم ہے (باب التفسیر سورہ نٓ والقلم) اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی سورہ القلم کی پہلی آیت "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ" کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے

قلم کو تخلیق کیا (سورۃ القلم، قرطبی ۱۸: ۲۲۳)

رابعاً: عام مستند و قدیم کتب سیرت جیسے سیرت ابن اسحاق (ترتیب ابن ہشام) طبقات ابن سعد (سیرت نبوی سے متعلق پہلی دو جلدیں) بلاذری کی کتاب انساب الاشراف (جلد اول جو سیرت نبوی پر ہے) اور بیہقی کی دلائل النبوۃ اور اسی طرح ابونعیم کی دلائل النبوۃ۔ قاضی عیاض الاندلسی کی کتاب الشفاء۔ ابن سید الناس کی عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر اور شیخ الاسلام الذہبی کی تاریخ الاسلام (جلد اول و دوم جو سیرت نبوی پر ہیں) نیز حافظ ابن قیم کی زاد المعاد وغیرہ ان میں سے کسی کتاب میں اس نام نہاد نور محمدی کی حدیث کا ذکر نہیں اور ہمیں یہ بات مکرر کہنا پڑتی ہے کہ یہ حدیث شیعہ مصنفین کی اختراع کردہ ہے، ان کا منشا یہ ہے کہ اس کے ساتھ وہ اپنے ائمہ اثنا عشر کے نور کی تخلیق کی تائید بھی کر سکیں جیسا کہ ملا باقر مجلسی کی مجمع بحار الانوار کی پندرہویں جلد سے واضح ہے، جس میں نور محمدی کی تخلیق کے ساتھ ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دوسرے ائمہ اہل بیت کے نور الٰہی یا نور محمدی سے پیدا ہونے کے متعلق مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں۔

اس تحریر کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کو نور الٰہی سے کچھ حصہ ہی نہیں ملا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ نور عام صالح مسلمانوں کے لیے بھی تخلیق کیا ہے جس کا ذکر متعدد مقامات پر قرآن کریم میں آیا ہے مثلاً:

یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ یَسْعٰی نُوْرُھُمْ بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ (الحدید: ۱۲)

وہ دن جب تم مومنین اور مومنات کو دیکھوگے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف چل رہا ہے۔

پھر یہ ہے اللہ کے آخری نبی اور اشرف المرسلین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو انہیں نور الٰہی میں سے حصہ وافر ملا تھا لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ اللہ نے سب سے پہلے نور محمدی کو پیدا کیا اور اسی سے اپنے عرش و کرسی وغیرہ کو بھی پیدا کیا۔ اس طرح تو اللہ تعالیٰ جس کی صفت غنی و صمد ہے یعنی وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے، وہ اپنے عرش وغیرہ کی تخلیق کے لیے نور محمدی کا نعوذ باللہ محتاج ٹھہرے گا۔ نور محمدی سے متعلق حدیث پر نقد و جرح کرنے کے بعد آخر میں ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صحیح حدیث نقل کرتے ہیں جو آپ سے سچی محبت کرنے والوں اور آپ کے حقیقی متبعین کے لیے مشعل راہ ہے۔

لاتطرونی کما اطرت النصاری عیسیٰ بن مریم فتھلکوا کما ھلکوا۔

میری ایسی (مبالغہ آمیز) تعریف نہ کرو جیسی عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی کی اور اس کے نتیجہ میں تم اسی طرح ہلاک ہو جس طرح وہ ہوئے۔

ایک اور صحیح حدیث بھی جو بخاری و مسلم وغیرہ میں ہے، اس نام نہاد حدیث کے وضعی اور جھوٹی ہونے پر دلالت کرتی ہے، یہ ہے:

اللھم اجعل فی قلبی نوراً وفی لسانی نوراً، وفی بصری نوراً، وفی سمعی نوراً، وعن یمینی نوراً، وعن یساری نوراً، ومن فوقی نوراً، ومن تحتی نوراً،

یا اللہ تو میرے دل میں نور عطا فرما، میری زبان میں نور دے، میری آنکھوں کو نور دے، میری سماعت کو نور دے، میرے دائیں کو نور دے، میرے بائیں کو نور دے، میرے اوپر نور دے،

ومن امامی نوراً، ومن خلفی نوراً،	میرے نیچے نور دے، میرے آگے نور
واجعل فی نفسی نوراً، واعظم	دے، میرے پیچھے نور دے، میرے
لی نوراً،	نفس میں نور دے اور مجھے عظیم نور عطا فرما۔

اب یہ واضح ہے کہ اگر اس مذکورہ صدر حدیث کے مطابق ساری کائنات اور "عرش و کرسی" حضورؐ کے نور سے پیدا کیے گئے ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا نہ فرمایا کرتے جس میں اللہ تعالیٰ سے نور کی طلب ہے۔

استدراک مضمون تحریر کرنے کے بعد ایک کرم فرمانے امام غزالی سے منسوب ایک کتاب مجربات امام غزالی کی طرف مجھ کو توجہ دلائی، جس کا ترجمہ تقریباً نوے سال قبل مولانا سید حافظ یاسین علی حسنی زمانی نے کیا تھا اور وہ پہلی بار ۱۳۲۸ھ میں چھپی تھی، اب لاہور کے ایک ناشر الفیصل بکڈپو نے اس کو فوٹو کاپی کرکے شایع کیا ہے، افسوس یہ ہے کہ امام غزالی کی اصل کتاب کا نام اس میں نہیں دیا گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ پہلی اشاعت کے دیباچے میں مذکور ہو، اس کا ایک باب طب جسمانی پر ہے جس میں تشریح بدن اور کچھ دواؤں کا ذکر ہے اور دوسرا طویل باب (مقالہ) الٰہیات پر ہے۔ امام غزالی کی تصنیفات میں طب سے متعلق باتوں کا ذکر کسی کتاب میں نہیں اس لیے میرے خیال میں یہ کتاب امام غزالی کی نہیں معلوم ہوتی۔

اس کے دوسرے باب یا مقالے میں نور محمدی سے متعلق زیر بحث حدیث کا ذکر ہے جس میں مضمون کی تفصیلات یعنی نور محمدی کے چار حصوں میں تقسیم کا ذکر نئے انداز میں ہے (ص ۲۶۳) اور ساتھ ہی اس کے برعکس صفحہ ۲۰۱ پر یہ درج ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا اور یہ بھی کہ سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔ نور محمدی سے متعلق حدیث کے اس تیسرے صیغہ سے بھی اس کے موضوع ہونے پر روشنی پڑتی ہے، ویسے بھی اس کتاب میں امام غزالی کی احیاء العلوم کی طرح بہت سی ضعیف اور موضوع احادیث مذکور ہیں اور لایق اعتماد نہیں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب، پٹنہ

اقبال کے کلام میں "مسلمانی" ایک اصطلاح ہے جس سے تیرہ اشعار ہیں۔ ان میں ایک ترکیب "صہبائے مسلمانی" ہے جس سے ایک ہی درج ذیل شعر "محراب گل افغان کے افکار" کے آخری بند کا آخری شعر ہے ؎

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا   تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی

"صہبائے مسلمانی" سے اقبال کی مراد اسلام کی شراب ہے، جس شراب کی تندی و تیزی تلوار کی تیزی جیسی ہے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کی بدولت ایک مومن میں شمشیر براں کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔

"مسلمانی" کی اصطلاح کو گرفت میں لانے کے لیے ہمیں پہلے "اسلام" اور "مسلمان" کی خاصیت جو قرآن مجید میں وارد ہے، اسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ سورۂ آل عمران ۳ کی آیت ۱۹ میں فرمایا گیا ہے کہ: "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"۔ یعنی اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صرف ایک ہی نظام زندگی اور ایک ہی طریقہ حیات صحیح اور درست ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان اللہ کو اپنا مالک و معبود تسلیم کرے اور اس کی بندگی و غلامی میں اپنے آپ کو بالکل سپرد کر دے اور اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے جو ہدایات اسے پہنچی ہیں صرف انہی

کی پیروی کرے۔ اسی طرزِ فکر و عمل کا نام "اسلام" ہے۔

پھر سورۃ البقرہ ۲ کی درج ذیل آیات ۲۰۸ اور ۲۰۹ میں ارشاد ہے کہ:۔

"اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آچکی ہیں، اگر ان کو پالینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی تو خوب جان لو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے"۔

علاوہ ازیں سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۱۶۱ میں دین اسلام کو "صراطِ مستقیم" سے تعبیر کرتے ہوئے درج ذیل اگلی دو آیات میں "مسلمانی" کی قرآنی ماہیت سامنے آتی ہے، جہاں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب فرماکر ہدایت دی گئی ہے کہ:

"کہو: میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھ کو حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں"۔

ان آیات کی رو سے قرآن میں "مسلم" اسے کہتے ہیں جو خدا کے آگے سرِ اطاعت خم کردے، خدا ہی کو اپنا مالک، آقا، حاکم اور معبود مان لے، جو اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سپرد کردے اور اس ہدایت کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے جو خدا کی طرف سے آئی ہو۔

"اسلام" اور "مسلمان" کی مندرجہ بالا خاصیت کے پیشِ نظر "مسلمانی" نام ہے پورے کے پورے اسلام میں آجانے کا، جہاں ایک مومن سورۂ یونس ۱۰ کی آیت ۱۰۵ کے بموجب یکسو ہوکر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک دین اسلام پر قائم کردے اور اس دین کو، اس بندگی خدا کے طریقے کو، اس طرزِ زندگی کو کہ پرستش، بندگی، غلامی، اطاعت، فرمانبرداری

سب کچھ صرف اللہ رب العالمین ہی کی کی جائے، ایسی یکسوئی کے ساتھ اختیار کرے کہ کسی دوسرے طریقے کی طرف ذرہ برابر میلان و رجحان بھی نہ ہو اور ان ٹیڑھے راستوں پر ایک غلط انداز نگاہ بھی نہ ڈالے جن پر دنیا چل رہی ہے۔ بالفاظ دیگر "مسلمانی" نام ہے اسلام کو اپنے لیے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے قبول کرلینے کا۔ اسلام کے دیئے ہوئے طریق فکر اور طرزِ زندگی کے خلاف کسی قسم کی مزاحمت باقی نہ رکھنے کا اور یہ طے کرلینے کا کہ اب وہ اسی کی پیروی میں زندگی بسر کریں گے۔ ان کی یہ اطاعت محض ظاہری نہیں بلکہ دل سے اسلام کی رہنمائی کو حق ماننے کی وجہ سے ہے۔ ان کا ایمان یہی ہے کہ فکر و عمل کا جو راستہ قرآن اور رسول اللہ ﷺ نے دکھایا ہے وہی سیدھا اور صحیح راستہ ہے اور اسی کی پیروی میں انکی فلاح ہے۔

ایمان کی صحیح کیفیت جو "مسلمانی" کی راہ اختیار کرنے سے پیدا ہوتی ہے اسے ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یوں بیان فرمایا ہے:۔

"ایمان کا لذت شناس ہوگیا وہ شخص جو راضی ہوا اس بات پر کہ اللہ ہی اس کا رب ہو اور اسلام ہی اس کا دین ہو اور محمد ﷺ اس کے رسول ہوں"۔ (مسلم)

اب اقبال جب کہتے ہیں کہ: "تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی" تو ان کی مراد صہبائے اسلام کے پیدا شدہ اس سرور سے ہے جو ایک مومن کے پورے کے پورے اسلام میں آجانے اور یکسو ہوکر اللہ کی بندگی بجالانے کو اپنی زندگی کا شعار بنالینے سے پیدا ہوتا ہے اور جس سرور کی بدولت وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ:

"مالک، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی۔ پس اے ہمارے آقا، جو قصور

ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر"۔ (سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۱۹۳)

اقبال نے اسی سرور کے لیے استعارے کے طور پر "صہبائے مسلمانی" کو تلوار کی تیزی سے تعبیر کیا ہے۔ جس سرور پر "بال جبریل" کی غزل ۲ (دوم) کے یہ اشعار بھی ہیں جو "مسلمانی" کی ماہیئت پر مزید روشنی ڈالتے ہیں:

اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا | ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز
جو ذکر کی گرمی سے شعلہ کی طرح روشن | جو فکر کی سُرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

دوسرے شعر میں ذکر سے مراد ہے عشقِ رسولؐ جن کی بدولت قلب منور ہو جاتا ہے اور فکر سے مراد ہے ذہن میں چند مسلمات کو اس طرح ترتیب دینا کہ ان کی مدد سے نئے معارف حاصل ہو سکیں اور جو حقیقت رسی بجلی سے بھی زیادہ تیز ہو۔

گرچہ "مسلمانی" سے اقبال کے کلام میں تیرہ اشعار ہیں مگر ان کے بارہ میں درج ذیل تین اشعار میں صرف "مسلمانی" لایا گیا ہے اور باقی میں تراکیب وضع کی گئی ہیں جن میں ایک ترکیب "صہبائے مسلمانی" اوپر گزر چکی ہے۔ ان تین اشعار میں پہلا شعر "بال جبریل" کی غزل ۱۲ (دوم) کا ہے اور باقی "علی الترتیب" "ضرب کلیم" کی نظمیں "سلطانی" اور "فقر و راہبی" کے ہیں مگر "مسلمانی" کی ماہیئت ہر جگہ وہی ہے جن پر اوپر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی | نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق
مثالِ ماہ چمکتا تھا جن کا داغِ سجود | خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی
کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی | تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
ہزار پارہ ہے کہسار کی مسلمانی | کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زناری

پہلے شعر میں اقبال کی مراد یہ ہے کہ اسلام کا معیار فقہی احکام نہیں بلکہ عشقِ رسولؐ ہے۔ اقبال فقہی احکام کے منکر نہیں مگر ان کے نزدیک عشقِ رسولؐ سے سرشار ہونے والے شخص سے اگر ارکان اسلام کی تعمیل میں کوتاہی بھی ہو جائے تو بھی وہ مسلمان رہتا ہے لیکن اگر ایک شخص ارکانِ اسلام تو بجا لاتا ہے مگر اس کا دل عشقِ رسول سے خالی ہے تو اس پر قرآنی معنوں میں "مسلمانی" کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ دوسرے شعر میں اقبال مغربی تعلیم اور اس کے زیر اثر مغربی تہذیب و تمدن کی ملامت کرتے ہوئے مسلمانوں پر تُف کرتے ہیں کہ اس نے زندگی کے چند روزہ عیش و آرام کی خاطر فرنگیوں کی غلامی قبول کر لی ہے اور ان کے تہذیب و تمدن کو اپنا شعار بنا کر خود کو دینِ اسلام سے بیگانہ کر لیا ہے۔ تیسرے شعر میں اقبال نے فقر و رہبانیت کے فرق کو واضح کیا ہے۔ اقبال "مسلمانی" کا اطلاق اس مسلمان پر نہیں کرتے جو فقر و رہبانیت کو ایک ہی چیز سمجھتا ہے۔ وہ بلا واسطہ سورۂ الحدید ۵۷ کی آیت ۲۷ کی طرف مسلمانوں کا دھیان مبذول کراتے ہیں جہاں "رہبانیت" کو "بدعت" قرار دیتے ہوئے خدا نے اسے نصرانیوں کی ایجاد فرمایا ہے اور پھر حضور انورؐ کا ارشاد ہے: "لا رهبانية في الاسلام"۔

"مسلمانی" سے متذکرہ بالا تین منفرد اشعار کے علاوہ آٹھ تراکیب ہیں جن سے نو اشعار ہیں۔ ان آٹھ میں ایک "صہبائے مسلمانی" بھی ہے۔ اس سے دوسری ترکیب "شرعِ مسلمانی" ہے جس سے دو اشعار علی الترتیب "بال جبریل" کی غزلیات ۱۸ اور ۴۷ میں ہیں اور تیسری ترکیب "جذبِ مسلمانی" ہے جس سے ایک ہی شعر متذکرہ بالا غزل ۱۸ میں "شرعِ مسلمانی" کے ساتھ آئی ہے۔ دونوں اشعار درج ذیل ہیں:

اک شرعِ مسلمانی اک جذبِ مسلمانی | ہے جذبِ مسلمانی سرِ فلک الافلاک

یا شرعِ مسلمانی، یا دیر کی دربانی یا نعرۂ مستانہ، کعبہ ہو یا بت خانہ

یہ دونوں اشعار قطعہ بند ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک کا نام "شریعت" ہے اور دوسری کا نام اسی شریعت کا باطنی پہلو ہے جسے "طریقت" کہتے ہیں۔ شریعت سے مراد وہ احکام اور پابندیاں ہیں جو شرائع الٰہیہ نے عائد کی ہیں۔ "جذبِ مسلمانی" شریعت کا باطنی پہلو ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ صرف ارکان اسلام جیسے روزہ اور نماز اور اس طرح کی دیگر عبادات کرکے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت کے تقاضے پورے ہوگئے۔ "شرعِ مسلمانی" یعنی پابندیِ ارکان اسلام سے بھی بالاتر ایک درجہ ہے جسے وہ "جذبِ مسلمانی" کا نام دیتے ہیں۔ یہ "جذب" ہے مقامِ عشقِ الٰہی بتوسط عشقِ رسولؐ (بمصداق سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیات ۳۱ اور ۳۲) کیونکہ اس کے بغیر نہ تو عملِ صالح ممکن ہے اور نہ دل میں یقین کا رنگ پیدا ہوسکتا ہے۔ "جذبِ مسلمانی" یعنی مقامِ عشق و محبت وہ درجہ ہے کہ جب مسلمان اسے حاصل کرلیتا ہے تو فلک الافلاک یعنی ساری کائنات کے اسرار و حقائق اس پر کھل جاتے ہیں۔

"مسلمانی" سے چوتھی ترکیب "اندازِ مسلمانی" ہے جس سے ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی نظم "جوابِ شکوہ" کے بیسویں بند کا ہے ؎

ہر کوئی مست مئے ذوقِ تن آسانی ہے تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟

اس شعر میں اس ترکیب سے مراد اتباعِ رسولؐ ہے بمصداق اس حدیث کے کہ :۔

"تم میں کوئی شخص مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس چیز کی تابع نہ ہوجائے جسے میں لایا ہوں" (شرح السنۃ)

"مسلمانی" سے پانچویں ترکیب "رمزِ مسلمانی" ہے جس سے ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی

نظم "طلوعِ اسلام" کے چوتھے بند کا ہے ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

اس شعر میں اقبال نے بلاواسطہ مسلمانوں کو "رمزِ مسلمانی" پر سورۃ الانفال ۸ کی پہلی آیت، سورۃ الفتح ۴۸ کی آیت ۲۹ اور سورۃ الحجرات ۴۹ کی آیت ۱۰ کی یاد دلائی ہے جہاں مومنوں کو آپس کے تعلقات میں "اخوت کی جہانگیری" اور "محبت کی فراوانی" کا درس دیا گیا ہے۔ اس "رمزِ مسلمانی" پر مسلم و بخاری میں حضرت نعمان بن بشیرؓ سے ایک روایت منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"تم مومنوں کو آپس کے رحم اور محبت اور ہمدردی کے معاملہ میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے"۔

"مسلمانی" سے چھٹی ترکیب "ننگِ مسلمانی" ہے جس سے ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱۵ (دوم) کا ہے ؎

مجھ کو تو سکھا دی ہے، افرنگ نے زندیقی اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا انگریزی داں طبقہ تو مغربی تعلیم کی بدولت دین سے برگشتہ ہوگیا ہے مگر اس زمانہ کے ملانے تو کسی کالج میں تعلیم نہیں پائی تو پھر وہ کیوں دین اسلام کے لیے موجب ننگ و عار ہیں۔

"مسلمانی" سے ساتویں ترکیب "معراج مسلمانی" ہے جس سے کلام میں ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی نظم "ایک نوجوان کے نام" میں ہے ؎

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

اس شعر کو گرفت میں لانے کے لیے اس سے قبل کا شعر پیش نظر رکھنا ضروری ہے ؎

امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

اس ترکیب سے اقبال مسلمانوں کو اپنے میں شانِ استغنا پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں جو صحابۂ کرامؓ کا طرۂ امتیاز تھا۔ واضح ہو کہ صفتِ استغنا اقبال کے نظامِ افکار میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، "بالِ جبریل" کی غزل ۱۱ (دوم) میں کہتے ہیں ؎

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

اور پھر "ضربِ کلیم" کی نظم "فقر و راہبی" میں کہتے ہیں ؎

یہ فقرِ مسلماں نے کھو دیا جب سے رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

اس شعر میں "دولتِ سلمانی" سے شانِ استغنا ہی مراد ہے۔

استغنا سے اقبال کی مراد بے نیازی کا رنگ ہے جو ایک مومن کی مختلف شانوں میں ایک شان ہے اور یہ رنگ صرف شانِ فقر سے پیدا ہو سکتا ہے جو منحصر ہے اتباعِ رسولؐ پر۔ خدائے تعالیٰ نے سورۂ یونس ۱۰ کی آیت ۶۸ اور سورۂ ابراہیم ۱۴ کی آیت ۸ اور سورۂ لقمٰن ۳۱ کی آیت ۱۲ میں اپنی ایک صفت "غنی" (بے نیازی) بتائی ہے جو اللہ کے ناموں میں ایک نام بھی ہے۔ اقبال اپنے فارسی مجموعۂ کلام "رموزِ بے خودی" میں کہتے ہیں :

بے نیازی رنگِ حق پوشیدن است رنگِ غیر از پیرہن شوئیدہ است

چونکہ خدائے تعالیٰ نے سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۳۸ میں اللہ کا رنگ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اس لیے اقبال مسلمانوں کو خدا کی اس صفت استغنا کا رنگ خود میں پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں جسے وہ "معراجِ مسلمانی" کا نام دیتے ہیں۔

"مسلمانی" سے آٹھویں اور آخری ترکیب "میراثِ مسلمانی" ہے جس سے ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی نظم "فقر" کا ہے ؎

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیری

اس نظم میں اقبال نے فقر کی کئی قسمیں بتائی ہیں مگر اس ترکیب سے جس فقر کی وہ بات کرتے ہیں وہ

ایسا ہے کہ جس کی تاثیر سے مٹی سونا بن جاتی ہے یعنی جس سے کوئی قوم دنیا میں سربلند ہوتی ہے۔ اس شعر میں "سرمایۂ شبیری" کا نام اقبال نے "میراثِ مسلمانی" رکھا ہے۔ جس کا نام حضرت امام حسینؓ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اقبال نے "مسلمانی" کے تضاد میں ایک اصطلاح "نامسلمانی" بھی وضع کی ہے جس سے کلام میں درج ذیل دو اشعار دو رباعیوں میں ہیں۔ پہلی رباعی "بالِ جبریل" کی ہے اور دوسری "ارمغانِ حجاز" کی :۔

حکیمی نامسلمانی خودی کی کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی

تجھے گُر فقر و شاہی کا بتا دوں غریبی میں نگہبانی خودی کی

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد تجلی کی فراوانی سے فریاد

گوارا ہے اسے نظارۂ غیر نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

پہلی رباعی میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشین کرتے ہیں کہ فلسفہ اور منطق کے مطالعہ یا ان فنون میں مہارت حاصل کرنے سے خودی کے اندر اسلام کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ بسا اوقات یہ علوم و فنون اللہ اور بندہ کے درمیان پردہ بن جاتے ہیں۔ اقبال نے "بالِ جبریل" کی غزل ۱۶ (دوم) میں کہا ہے ؎

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش لاکھ حکیم سربجیب، ایک کلیم سربکف

"ارمغانِ حجاز" کی رباعی میں اقبال عقل و نگہ کا موازنہ کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک عقل انسان کو کبھی حقیقت شناسی میں مدد نہیں کر سکتی جس کے لیے نظر کی ضرورت ہے۔ اقبال کے نزدیک مثالی نظر حضرتِ ابراہیمؑ کی ہے جس کے لیے انہوں نے "براہیمی نظر" کی اصطلاح وضع کی ہے اور جس سے ایک ہی شعر "بانگِ درا" کی نظم "طلوعِ اسلام" کے پانچویں بند کا چوتھا شعر ہے۔ یہ عقل کا نہیں بلکہ نظر کا فیضان تھا کہ ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی ("بانگِ درا" غزلیات حصہ سوم۔ تیسری غزل)

ابتدائی دور کا گوجری ادب

از پروفیسر نثار احمد انصاری۔ احمد آباد

(یہ مقالہ گجرات ودیا پیٹھ احمد آباد میں فروری ۱۹۹۱ء میں منعقدہ "گوجری ادب" سیمینار میں پڑھا گیا تھا، محترم ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب ڈیسائی کی خواہش پر نظر ثانی کے بعد قارئین معارف کی نذر کیا جا رہا ہے۔ نثار انصاری)

ایک مخلوط بولی کی حیثیت سے گجرات میں اردو کی پیش رو ایک نئی زبان کی بنیاد آٹھویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی سے کافی پہلے پڑ چکی تھی۔ تیرہویں صدی کے اختتام پر سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں گجرات فتح ہوا، اس سے صدیوں پیشتر ہی سے وہاں عرب اور ایرانی سیاحوں، تاجروں، جہاز رانوں اور دوسرے طبقے کے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی اور وہ بھدریشو (ضلع کچھ) سومناتھ ویراول، دیو کھمبات، رانذیر (سورت) سوپارہ وغیرہ ساحلی مقامات کے علاوہ نہروالہ پٹن جیسے اندرون ملک کے شہروں میں بھی بکثرت آباد ہونے لگے تھے جس کا ثبوت کتبوں اور معاصر تاریخی آثار سے ملتا ہے[1] اس کے برعکس دکن کا خطہ جس میں جنوبی ہند کے مغربی ساحلی علاقے کوکن اور شمالی ملیبار اپنی مخصوص جغرافیائی جائے وقوع کی بنا پر شامل نہیں تھے، بیرونی اثرات قبول نہیں کر سکتا تھا، نیز گجرات کی بندرگاہیں از منۂ قدیم سے شمالی مغربی ہند، افغانستان وغیرہ ممالک کے تاجروں اور بیرونی دنیا کے مسافروں کی آمد و رفت اور کاروبار کا ذریعہ تھیں۔

اس مختصر مضمون میں اس بحث کی گنجائش نہیں کہ قدیم اردو زبان کی پیدائش اور نشو و نما گجرات میں ہوئی یا دکن میں؟ تاہم اردو زبان کی تاریخ وارتقاء سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس موضوع پر لکھنے والے تمام اہل قلم محققین اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ جن خطوں کا اطلاق خاص دکن پر عائد ہوتا ہے وہ جنوبی ہند کے تلنگ، مرہٹواڑہ اور کرناٹک کا شمالی حصہ وغیرہ علاقے اور ان کے شہر گلبرگہ، بیجاپور، گولکنڈہ اور حیدرآباد جو دکنی زبان و ادب کے گہوارے رہ چکے ہیں۔ وہ ہندوستان کے دوسرے خصوصاً شمالی علاقوں اور بیرونی ہند کے مذکورہ بالا ممالک سے تقریباً کلی طور پر آمد و رفت کے وسائل کی کمی اور پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں کی وجہ سے کٹے ہوئے تھے۔ آٹھویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی تک ایک دو بڑے فوجی حملوں کو چھوڑ کر شمالی اور جنوبی ہند کے بڑے پیمانے پر باہمی میل جول کے شواہد پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے اور یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ آٹھویں نویں صدی ہجری تک شمالی ہند سے دکن جانے کا آسان ترین راستہ گجرات سے ہی تھا۔ دہلی وغیرہ کے کئی خاندان جن میں خانوادہ ہائے اہل عرفان شامل ہیں دکن کا رخ کرتے تو گجرات کا راستہ اختیار کرتے اور ان میں سے اکثر و بیشتر گجرات کی مہمان نواز زمین کو ہی اپنا مسکن بنا لیتے تھے۔ آٹھویں صدی کے اواخر میں گلبرگہ (دکن) کے مشہور و معروف بزرگ حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز بھی پٹن، بھروچ، کھمبات وغیرہ مقامات سے ہوتے ہوئے گلبرگہ تشریف لے گئے تھے۔ اوپر گزرا ہے کہ از منۂ قدیم سے گجرات کی بندرگاہیں شمالی ہند ہی نہیں افغانستان اور وسط ایشیا کے اسلامی ممالک کے باشندوں کے لیے باب الحرمین بنی ہوئی تھیں۔ جوناگڑھ شہر میں تیرہویں صدی میں

پائے گئے۔ عربی کتبے میں ایک باثر شخصیت عفیف الدنیا والدین ابوالقاسم علی الامیرجی کو ملک الصدور والنواخذ عماد الحاج والحرمین کے القاب سے یاد کیا گیا ہے[۳۲]۔ گجرات میں دہلی کے سلاطین کی حکومت کے قیام کے نتیجے میں شمالی ہند کے اہلِ دولت اور اہلِ لشکر کے علاوہ مختلف پیشوں اور گروہوں کے جو لوگ بکثرت سکونت پذیر ہوئے ان میں عربی، فارسی زبانیں جاننے والوں کی اکثریت تھی۔ ان مخصوص حالات کے پیشِ نظر گجرات میں گوجری جیسی مخلوط زبان کا جنم لینا اور پروش پانا بدیہی اور فطری امر تھا۔

علمی دنیا کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ آج تاریخ سے دلچسپی کے فقدان اور علم کی جانب سے بے توجہی کے نتیجے میں گجرات جو عرصہ دراز تک علم و عرفان اور فضل و دانش کا گہوارہ رہا ہے اس کی عظمت رفتہ کا نوحہ خواں بھی ڈھونڈھنے سے بڑی مشکل سے ملے گا، گجرات کے علمی ادبی اور ثقافتی کارناموں کی طرف ماضیِ قریب میں بیرونِ گجرات کے علم دوست اور دانش پرور حضرات کی توجہ مبذول ہوئی تھی، جنھوں نے اس خطے کی علمی اور ثقافتی تاریخ کا جائزہ لے کر علمی دنیا کو ان سے روشناس کرایا۔ اس نہایت پسندیدہ کام میں اولیت کا سہرا اپنے عہد کے متبحر عالم اور جامع العلوم مولانا حکیم سید عبدالحئی مرحوم کے سر ہے جو دورِ حاضر کے عظیم مفکر اسلام اور مصنف حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کے والد محترم ہیں انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے سالانہ اجلاس کے لیے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کی فرمائش پر گجرات کی علمی خدمات پر ایک جامع اور پُر از معلومات مقالہ لکھا جو دسمبر ۱۹۱۸ء میں جنوبی گجرات کے مشہور اور اردو زبان و ادب اور تعلیم کے اہم مرکزی شہر سورت میں پڑھا گیا، جسے ان کے صاحبزادے حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے یاد ایام کے نام سے کتابی

صورت میں ۱۹۱۹ء میں شایع کیا[۳۳]۔ اس کے بعد دارالمصنفین کے سابق رفیق اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے حقیقی بھتیجے مولوی سید ابوظفر ندوی صاحب نے گجرات کی سیاسی اور تمدنی تاریخ پر نہایت وقیع کتابیں لکھیں اور گجرات کے سلسلۂ مغربیہ کے مشہور بزرگ شیخ کھٹو سرکھیجی کے دو غیر مطبوعہ فارسی ملفوظ تحفۃ المجالس اور مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول کا اردو ترجمہ سیرت احمدیہ کے نام سے شایع کر کے گجرات کی تاریخ و تمدن اور اس کے روحانی بزرگوں کے فیض و ارشاد سے اردو قارئین کو روشناس کرایا۔ علامہ سید سلیمان صاحب کے ایک اور عزیز اور دارالمصنفین کے سابق رفیق سید نجیب اشرف صاحب مرحوم احمد آباد کی گورنمنٹ اعلیٰ تعلیم گاہ گجرات کالج میں فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے تشریف لائے اور انہوں نے یہاں کے اپنے مختصر قیام کے دوران حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کی "پنجاب میں اردو" اور نصیر الدین ہاشمی صاحب مرحوم کی "دکن میں اردو" کے نہج پر "گجرات میں اردو" کے نام سے ایک مبسوط کتاب کی تالیف کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے اس وقت اور بعد میں بھی تلاش و تحقیق کا سلسلہ جاری رکھ کر کافی مواد بھی جمع کیا، جن کی نگرانی میں ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی مرحوم نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ قلمبند کیا، جو ندوی صاحب کے مقالہ ہی کی نئی شکل ہے، مدنی صاحب نے اپنی کتاب سخنورانِ گجرات میں لکھا ہے کہ بمبئی میں تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے یونیورسٹی کی ذمہ داریاں اور انتظامی مصروفیتیں اتنی بڑھیں کہ ندوی صاحب کوئی اہم علمی و ادبی کام انجام نہیں دے سکے اس طرح گجرات میں اردو والا ان کا منصوبہ بھی بالائے طاقِ نسیاں ہو کر رہ گیا[۳۴]۔ البتہ انہوں نے گوجری کے ایک نصاب نامہ کی اشاعت کی جس کا نام لغات گجری ہے اور جو ان کی بڑی اہم اور مفید خدمت ہے[۳۵]۔

گوجری زبان کی ابتدا اور نشوونما کی تاریخ کے صحیح مرتب ہونے کا سہرہ مرحوم بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کے سر ہے۔ اول الذکر کی اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام نے ایک مختصر رسالہ ہونے کے باوجود گجرات میں اردو زبان کی تاریخ کے لیے ایک نئی راہ نکالی چنانچہ حافظ محمود خاں شیرانی کے متعدد مقالوں نے مولوی عبدالحق صاحب کی کھینچی ہوئی تصویر کے نقشے میں رنگ آمیزی کا کام کیا اور گوجری زبان کی تاریخ میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک لائحۂ عمل مہیا کیا۔ ان دو بزرگوں کی کوششوں کا مختصر جائزہ کچھ مزید توضیح و اضافے کے ساتھ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار مرحوم نے لیا، انھوں نے گجرات کالج میں تقریباً بارہ سال تک فارسی اور اردو کی تعلیم کے فرائض انجام دیے تھے اور گجرات کی علمی اور ادبی خدمات پر ایک بصیرت افروز معلوماتی مقالہ انگریزی زبان میں شایع کیا تھا، اپنے ایک اور انگریزی مقالے میں انھوں نے "گجرات کا گوجری ادب" میں بھی اس پر روشنی ڈالی ہے جسکا اردو ترجمہ انھی کے قلم سے کراچی کی انجمن ترقی اردو پاکستان کے رسالہ اردو میں شایع ہوا ہے۔

ان کوششوں کے بعد گجرات میں اس موضوع پر مزید کام کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ دکن میں نصیر الدین ہاشمی مرحوم، سید محی الدین قادری زور مرحوم اور ان کے رفقا اور شاگردوں نے دکنی زبان کی تاریخ میں مولوی عبدالحق کے کام کو آگے بڑھانا اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا اور دکنی زبان کے بیسیوں مخطوطات کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر ان کو شایع کیا اور دکنی زبان و ادب کی تاریخ اور لغت وغیرہ مرتب کی۔ اس کے برعکس بدقسمتی سے گجرات اس قسم کی فداکارانہ کوششوں سے بیگانہ رہا۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی صاحب مرحوم کی سخنوران گجرات البتہ گجرات میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کی ایک مستند اور مفید تالیف ہے، لیکن جہاں تک گجرات میں اردو کے ابتدائی یعنی گوجری دور کا تعلق ہے وہ جیسا کہ سطور آیندہ سے عیاں ہوگا پیشروؤں کی دی ہوئی معلومات میں کچھ بھی اضافہ نہیں کرسکی۔

اردو زبان کی تاریخ سے متعلق مرتبین کا خیال ہے کہ گوجری ادب کی تشکیل دسویں صدی کے اواخر اور گیارہویں صدی کے اوائل میں ہوتی اس سے قبل اور مابعد کا زمانہ (ولی گجراتی اور امین گجراتی یعنی بارہویں صدی کی ابتدا تک) گوجری ادب سے خالی ہے۔ اس غلط خیال کے رواج پانے کی وجہ گوجری تالیفات کا منظر عام پر نہ آنا ہے۔ گوجری زبان کی نویں صدی سے قبل ادبی تشکیل ہوچکی تھی۔ لیکن اس دور کی ادبی نگارشات کی بازیافت تو کیا نشاندہی بھی نہیں کی گئی اور ان میں اکثر و بیشتر دستبرد زمانہ کی نذر ہوگئیں۔ گجرات میں بارہویں صدی ہجری کے نصف دوم کے سیاسی حالات، مرہٹوں کی لوٹ مار وغیرہ کے دوران خانقاہ حضرت شاہ عالم (م ۱۰۸۰ھ) اور دیگر خانقاہوں کے قیمتی مخطوطات کے ذخیرے جن میں یقیناً گوجری کی کتابیں بھی ہوں گی وہ شاہ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ھ) شاہ علی جیو گام دھنی (م ۹۷۳ھ) قاضی محمود دریائی بیرپوری (م ۹۴۱ھ) اور شاہ خوب محمد چشتی (م ۱۰۲۳ھ) کے مدون اور غیر مدون کلام کو چھوڑ کر ضایع ہوگئے۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ کم از کم گوجری ادب کے دسویں صدی قبل کے ادبی آثار یا زبان کے نمونے بہت کم دستیاب ہوئے ہیں، اردو زبان کی تاریخ کا ایک عام قاری محض شاہ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ھ) قاضی محمود دریائی بیرپوری (م ۹۴۱ھ) شاہ علی جیو گام دھنی (م ۹۷۳ھ) اور خوب محمد چشتی (م ۱۰۲۳ھ) کے گوجری کلام یا مستقل تصانیف

کے ناموں یا ان کے نمونۂ کلام سے آشنا ہیں۔ جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے
نویں صدی ہجری کے گوجری زبان کے جملوں اور دوہے جو حضرت سید برہان الدین عبداللہ
قطب عالم بخاری (م ۸۵۰ھ) اور ان کے صاحبزادے حضرت سید سراج الدین محمد شاہ عالم
(م ۸۸۰ھ) وغیرہ کے کہے ہوئے ہیں، ان کو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی مختصر لیکن
جامع اور اہم کتاب اور حافظ محمود خاں شیرانی صاحب مصنف "پنجاب میں اردو" نے
اپنے مضمون گوجری یا گجراتی اردو سولھویں صدی عیسوی میں نقل کیے ہیں، شیرانی صاحب
کا مضمون لاہور کے اورینٹل کالج میگزین کے نومبر ۱۹۳۰ء اور فروری ۱۹۳۱ء کے شماروں
میں شایع ہوا ہے۔ اسی صدی کے نصف دوم میں گجرات کے مایۂ ناز عالم اور استاد الاساتذہ
حضرت شاہ وجیہ الدین علوی صاحب (م ۹۹۸ھ) کے بھی اسی زبان کے اقوال ملتے ہیں جو
ان کے فارسی ملفوظ کی کتابوں میں ملتے ہیں، ان میں سے صرف ایک ملفوظ بحر الحقائق
کے گوجری زبان کے نمونے کچھ سال پیشتر مولانا عبدالرحمن پرواز اصلاحی مرحوم نے مہاتما
گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر بمبئی کے رسالہ "ہندوستانی" میں شایع کیے تھے۔ لیکن یہ بھی
حقیقت ہے کہ ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں مستقل گوجری تصنیفات میں صرف
شاہ علی جیو گامدھنی کی جواہر اسرار اللہ اور شاہ خوب محمد چشتی کی خوب ترنگ کو جو
گجرات میں شایع ہوئی تھی چھوڑ کر مستقل ادبی تالیف سے ہم ناآشنا ہیں۔ ان کتابوں
میں خوب محمد چشتی کی "خوب ترنگ" کے سوا کوئی کتاب طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی لیکن
اس کی طباعت اول کا علم بھی بہت کم لوگوں کو ہونا تو سمجھ میں آسکتا ہے لیکن تعجب ہے کہ
بمبئی کے ڈاکٹر علی محمد خان جعفری کے مرتب کردہ اس کے تنقیدی ایڈیشن کا علم بھی کم ہی
لوگوں کو ہے جس کو گجرات اردو اکادمی کے سرگرم رکن، گجرات ودیاپیٹھ کے وظیفہ یاب

صدر شعبۂ اردو اور درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتب خانہ کے اعزازی نگراں پروفیسر
محی الدین بمبئی والا کی مساعی جمیلہ سے اردو اکادمی گجرات اسٹیٹ نے حال ہی میں شایع کیا ہے۔

نویں صدی ہجری کے ان منتشر اقوال، جملوں اور بعض شعروں کے علاوہ گوجری ادب
کی کوئی چیز ہمارے سامنے نہیں آئی۔ مثلاً سلطان قطب الدین احمد شاہ دوم کے شاہ عالم
کی مدح میں کہے ہوئے قصیدے کے دو شعر ہیں جن کی طرف سب سے پہلے ڈاکٹر سید اکبر علی
صاحب ترمذی نے اپنے مقالے جلالی احمد آبادی میں توجہ دلائی تھی۔ اس سے پتہ چلتا
ہے کہ کم از کم نویں صدی ہجری میں گوجری زبان ایک ادبی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس کے
شواہد کا ذکر میرے اس مختصر مقالے کا موضوع ہے۔ مجھے ان دنوں ہمہ گیر یا کم از کم وسیع
طور پر مروج جکریوں کی صورت میں گوجری کے دو نمونے اور دیگر جکریوں کی تصنیف
و تالیف کے شواہد ملے ہیں۔ احمد آباد کے مشہور بزرگ حضرت شاہ عالم کے منشی خاص
دولت شاہ آفرید کا جمع کردہ ملفوظ کنوز محمدی (نویں صدی ہجری) بدقسمتی سے دستیاب
نہیں ہے۔

خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ شاہ عالم صاحب ۸۶۰ھ سے مستقل طور پر نماز جمعہ
اور قبل عصر عوام و خواص کو باریاب فرماتے تھے، اس وقت ان باتعظیم لیکن ایک گونہ بے تکلف
مجلسوں میں مختلف موضوعات پر جو سوال و جواب اور تصوف کے اسرار و غوامض کی تشریح
و توضیح ہوتی تھی اور فقہی مسائل اور ارکان دین پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا یا صاحب مجلس کے
عربی فارسی رسالوں اور اقوال کی قرأت ہوتی تھی یا ان کی مدح میں مریدین اور دیگر شعرا
جو کلام سناتے تھے، اس قسم کے تفصیلی حالات کنوز محمدی سے لے کر مزید اضافوں اور
معلومات کے ساتھ حضرت شاہ عالم صاحب کے سجادہ اور معروف و مشہور عالم و مصنف

فارسی اور گوجری کے شاعر سید محمد مقبول عالم المتخلص بہ جلالی (م ۱۰۴۵ھ) نے جمعات شاہیہ کے نام سے ایک مجموعہ فارسی میں مرتب کیے تھے۔ انہوں نے چھ سال کے جمعات کی مجلسوں کے حالات کی چھ جلدیں مرتب کر لی تھیں لیکن ساتویں جلد نامکمل چھوڑ دی جس کی تکمیل ان کے پوتے اور صاحب سجادہ، محدث، عالم، مصنف، فارسی اور گوجری کے شاعر سید جعفر بدر عالم نے کی کچھ عرصہ پہلے تک ان سات جلدوں میں سے الگ بھگ چوتھی اور پانچویں جلدوں کے وجود کا علم تھا اور ایک جلد کا پتہ لگ بھگ ۱۹۱۵ء میں چلا۔ باقی جلدیں نایاب تھیں۔ خوش قسمتی سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے دو ذخیروں میں اس کی دو جلدیں چھٹی اور ساتویں دستیاب ہوئی ہیں، ان میں ایک تو وہی ہے جس کی نشاندہی ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ ہوئی تھی۔

چھٹی جلد کے مطالعے سے گوجری زبان و ادب کے گجرات میں چلن کا پتہ چلتا ہے خود حضرت شاہ عالم صاحب کے حلقے میں گوجری زبان اور اس کی مخصوص صنف جکری کا نہایت وسیع اور زیادہ رواج تھا۔ اس کتاب میں صرف ان حالات یا واقعات کا ذکر ہے جو حضرت شاہیہ کی جمعہ کی مجلسوں میں پیش آئے اور جو ان سے ہی متعلق تھے لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں گوجری زبان عوام و خواص کی مروجہ زبان تھی۔

جمعات شاہیہ کی اس جلد میں کم از کم چار پانچ گوجری نظمیں یا موسیقی کے سروں، تانوں اور لے پر بٹھائی ہوئی مخصوص صنف نظم کا ذکر ہے۔ ان میں سے دو جکریاں پوری کی پوری اس کتاب میں درج ہیں۔ ان جکریوں کے کہنے والوں میں عوام و خواص دونوں شامل ہیں۔ ان میں ایک ملک مبارک بن کالو ہے جس کے نام سے شہر احمد آباد کا

مشہور محلہ کالوپور موسوم ہے وہ سلطان محمود بیگڑہ امیر ملک کالو کا بیٹا تھا۔ جمعات شاہیہ میں مذکور ہے کہ مبارک کالو نے بھی متعدد بار حضرت شاہ عالم کے سامنے جکریاں سنائیں۔ جمعات شاہیہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مرید خاص مبارک کالو آپ کی مدح میں جکری کہہ کر تان باندھ کر لایا تھا جسے آپ کو سنایا۔

خود حضرت شاہ عالم کے اشعار بھی جمعات شاہیہ میں مذکور ہیں۔

قوالوں نے ایک مرتبہ حضرت سرور عالم کی مدح میں کہے ہوئے اشعار کو جو حضرت شاہ عالم صاحب کی زبان پر آئے تھے سنایا جن کو آپ نے کھڑے ہوکر پوری توجہ اور تعظیم سے سنا۔ اس کا ایک شعر یوں ہے:

خلیل اللہ کل ملک دنا دا   شاہ رسل جی واٹ ادھارا

ایک اور جکری گو شاعر شیخ بابو ہیں جنھیں حضرت شاہ عالم سے عقیدت تھی مولف جمعات شاہیہ رقمطراز ہیں کہ اس دوران آپ کے یعنی شاہ عالم کے وزیر با اعتقاد حضرت میاں مخدوم نے شیخ نام ایک عزیز کو جو مولانا جانی کے نواسے تھے آپکی ملازمت میں پیش کیا۔ وہ حضرت شاہ عالم کی مدح میں جو جکری کہہ کر لایا تھا اسے سنایا۔ جکری یوں ہے:

دیٹھے بیٹھے بیٹا بلائے   تم بن سائیں پیٹر نہ جائے

سمرن کرنے تن بدن لیتی   جانی ہیٹرا کی جن دیتی

پنجر پس نہ دیکھے کوئی   او کھ لائیں کھو گیا کوئی

کڑک کلیجی کھو سکھ کدھیا   جیوڑے انکیت ہے بلی سدھیا

حسن جمال دیا تیرے ہوئے   کیوں رے بجھاوے دو جا کوئے

دکھ نہ جانیں بانہا تولیں   جیو سدھارے جہاناں بولیں

قطب برہان کا پوت سو پیارا   جو سوہی جانیں دکھ ہمارا
بابو جنھوں لاگے پائے   منجھن میری پیڑ پنچھانے

ان کے علاوہ مولانا شرف الدین نامی ایک صاحب نے گوجری میں جکری تصنیف کی جس کی دھن باندھ کر حضرت شاہ عالم صاحب کو سنائی گئی۔

خود حضرت شاہ عالم صاحب بھی گوجری جکریاں تصنیف کیا کرتے تھے۔ صاحب جمعات شاہیہ فرماتے ہیں کہ حضرت شاہیہ کی روایت کے مطابق انہوں نے اپنے بچپن میں ایک جکری حضرت رسالت مآبؐ کی شان میں کہی تھی، اس کے چھ اشعار بھی انہوں نے اپنی کتاب میں درج کیے ہیں۔ جمعات شاہیہ میں لکھا ہے کہ:

"حضرت شاہیہ فرمودند در صغر سن ۔۔۔۔ جکری بہ نام سلطان الانبیاؐ سرود بستہ بودم"۔ یعنی حضرت شاہیہ نے فرمایا میں نے بچپن میں سلطان الانبیاؐ کے نام ایک جکری دھن پر باندھی تھی یہ جکری اس طرح ہے:

نس جا کندری میں کچھ دیٹھا   مسھی میدنی تہس ہی میٹھا
جب میں ہنس ہنس اتر کیتا   جب یہ جیو بدھاوی دیتا
جگ سباہی لاکھوں پائے   اسبا بسر جن دین ہٹائے
بہوت لاڈلیوں بچپنا لادھا   کھینچ انچل میں اس سوں باندھا
شاہ رسول ہوں بلھارا   میں کوں لائیں اس کی بارا

ظاہر ہے حضرت شاہ عالم صاحب کی طبع موزوں نے گوجری زبان میں جکریاں یا اشعار کہنے کا سلسلہ ضرور جاری رکھا ہوگا اور وہ ان کے ملفوظ اور دیگر کتابوں میں درج کیے گئے ہوں گے، لیکن بدقسمتی سے کچھ تو زمانے کے حوادث اور اسلاف کی

بے توجہی کی نذر ہو کر تلف ہو گئیں اور بچی کھچی صاحبان سجادگان کے بخل سے منظر عام پر نہیں آسکیں۔ محترم ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی صاحب نے مجھے بتایا کہ حضرت شاہ عالم کے موجودہ سجادہ حضرت موسیٰ میاں صاحب رضوی مدظلہ کے کتاب خانے میں جمعات شاہیہ کی ایک جلد ہے لیکن آج تک اس جلد کی زیارت نہ ہو سکی لہذا یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ یہ کون سی جلد ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ احمد آباد کے مشہور چشتی خانوادہ کے ایک بزرگ حضرت شیخ رشید الدین مودود لالا کی تیرہویں صدی ہجری میں تصنیف کردہ ہندوستان بالخصوص گجرات اور احمد آباد کے بزرگوں کے حالات اور نادر معلومات پر مشتمل نہایت ہی اہم اور ضخیم کتاب "مخبر الاولیا" میں گجرات کے بعض بزرگوں کے گوجری کلام کے بارے میں بہت مفید اور نایاب معلومات درج ہیں۔ غالباً مصنف کا خود نوشت اس کا نسخہ شاہی باغ احمد آباد میں واقع خانقاہ چشتیہ میں موجود ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس کتاب تک بھی ہماری رسائی نہیں ہوئی ۔ اس کے ایک نہایت ہی ناقص اور غلط مگر نسبتاً جدید نسخے کو دیکھنے کا موقع ڈیسائی صاحب کو ملا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں گجرات کے کئی بزرگوں کے گوجری اشعار کہنے کا ذکر ہے۔ مثلاً اورنگ زیب کے عہد کے مشہور عالم و فاضل شیخ عبد الفتاح عسکری جو مولانا روم کی مثنوی کے مشہور شارح اور مثنوی داں کے لقب سے مشہور ہیں ان کے بھی گوجری اشعار اس میں نقل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ خود دسویں صدی ہجری کے شیخ عیسیٰ چشتی اور دیگر بزرگوں کی جکری گوئی کا ذکر ہے۔ نیز کچھ اور بزرگوں مثلاً شاہ علی جیو گام دھنی کے بھی حسب موقع گوجری اشعار اور اقوال نقل کیے ہیں۔ ان میں قابل ذکر اس منظوم مکالمہ کا ٹکڑا ہے جو ان کے اور شاہ وجیہ الدین علوی صاحب کے

پیر و مرشد اور شطاری سلسلے کے مشہور و معروف بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاری کے
• درمیان احمد آباد کے شہر دہلی دروازے کے قریب ہوا۔

سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ آٹھویں نویں صدی ہجری کے مغربی سلسلے کے بزرگ شیخ احمد کھٹو جو اپنے زمانے کے ایک بڑے برگزیدہ ولی ہوئے ہیں اور جن کا مزار مبارک احمد آباد سے متصل سرکھیج نامی گاؤں میں واقع ہے۔ انہوں نے بھی گوجری زبان میں کچھ دوہے اور اشعار وقتاً فوقتاً کہے ہیں۔ ان میں سے کچھ آپ کے ملفوظ مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول میں ملتے ہیں۔ مثلاً ایک بار کسی شاعر نے آپ کے سامنے یہ شعر پڑھا:

توجانتا کرتار جی مجھ سائیں بے پیرا ساس سری سی ساز کرو تمہاری بالہا

اس کے جواب میں آپ نے یوں فرمایا:

توجانتا کرتار جی مجھ سائیں بے پیرا سائیں کی ہے سار بانجر باباجو من بستا

ایک بار ایک لڑکی کی آنکھ میں لگے ہوئے کاجل کو ناپسند فرماتے ہوئے آپ نے کہا:

دو کھارہ دکھا، کاجل جو کروں تو سوکن سکھ دینا نہ پیو دیکھن دیکہیں مجھ نہ آپ دیکھ سکیں

بھوں بوجھوں پن تا دو دن کیتی ماس دیا بجھری ایک نل جانوں برس پچاس

اس کے علاوہ بھی آپ کے اشعار ملتے ہیں۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر ایک اور مفروضہ کی طرف اشارہ کرنا بے جا نہ ہوگا۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری کے اواخر کے ولی گجراتی سے پہلے گوجری ادب کا سرچشمہ خشک ہو چکا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گیارہویں صدی میں شاہ خوب محمد چشتی (م ۱۰۲۳ھ) کے ہم عصر مگر عمر میں چھوٹے سید محمد مقبول عالم جلالی (م ۱۰۴۵ھ) جن کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے وہ بھی گوجری میں اشعار کہتے تھے۔ ان کے پوتے جن کا

آگے ذکر آچکا ہے، سید جعفر بدر عالم نے سادات بخاری، رضوی شاہی کے حالات میں آنحضرتؐ سے لے کر حضرت شاہ عالم تک کے حالات اور ان کے سلسلے کے بزرگوں کے اقوال و عقاید اور تصوف کے نکات اور متعلقہ بیسیوں امور پر ایک کتاب لکھی تھی جس کو انہوں نے روضات شاہی نام دیا تھا۔ کتاب کی ضخامت کے پیش نظر انہوں نے اس کو چوبیس حصوں میں ترتیب دیا۔ اس کتاب کی جلدوں کا پتہ نہیں چلا۔ ابھی ایک سال قبل تک اس کی ایک ناقص الوسط اور ناقص الآخر جلد کا پتہ تھا جو احمد آباد کے مشہور قاضی خاندان کے کتب خانہ میں موجود تھی اور اب نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے کتب خانے میں ہے[۱۱۵]۔ اس کی پہلی جلد کے وجود کا پتہ حال ہی میں چلا ہے، یہ کراچی کے ہمدرد یونیورسٹی کے کتب خانے میں ہے۔ اس کے نسخے کا تعارف جناب خضر نوشاہی صاحب معارف کے ایک شمارے میں کرا چکے ہیں[۱۱۶]۔ سنا ہے کہ حضرت موسیٰ میاں رضوی سجادہ نشین خانقاہ شاہ عالم کے کتب خانے میں اس کی چھ، سات جلدیں ہیں، ان تک رسائی نہیں ہو سکی۔ بہرحال نیشنل آرکائیوز والے نسخہ روضات شاہی کے آخر میں سید محمد مقبول عالم جلالی (م ۱۰۴۵ھ) ان کے صاحبزادے اور مغل بادشاہ شاہجہاں کے صدر الصدور سید جلال مقصود عالم المتخلص بہ رضا (م ۱۰۵۷ھ) اور ان کے صاحبزادے سید جعفر بدر عالم المتخلص بہ صفا (م ۱۰۸۹ھ) اور ان تینوں کے جد امجد حضرت شاہ عالم کی مدح میں کہے ہوئے فارسی اور گوجری اشعار درج ہیں[۱۱۷]۔ اس حصے کی زیراکس کاپی محترم ڈیسائی صاحب نے حاصل کر کے درگاہ حضرت پیر محمد شاہؒ کے کتب خانے کو دی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری میں بھی گوجری زبان کی شاعری کا چلن حسب دستور جاری رہا۔ اگر باقاعدہ تلاش و تفتیش کی جائے تو مزید معلومات کے انکشاف کا قوی امکان ہے۔

اسی طرح دلی کے بعد تا حال گجرات میں اردو ادب کے جائزے کے موضوع پر ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی صاحب کی سخنوران گجرات ایک بڑا علمی کارنامہ ہونے کے باوجود کما حقہ روشنی نہیں ڈال سکی۔ مثال کے طور پر مدنی صاحب نے حضرت پیر محمد شاہ تخلص اقدس کے گوجری کلام کا تو سرسری طور پر ہی سہی ذکر کیا ہے لیکن ان کے ایک ڈیڑھ درجن مریدوں کے جن میں خواتین بھی شامل ہیں اپنے پیر و مرشد کی مدح میں کہے ہوئے قصاید و مراثی کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ان نظموں اور مرثیوں کے مجموعے درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتبخانے میں موجود ہیں۔ اسی طرح تیرہویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل کے متعدد اردو شعراء کے ذکر سے بھی سخنوران گجرات خالی ہے۔ مدنی صاحب مرحوم کی نظر سے جلوۂ یار، پیام یار وغیرہ جیسے میرٹھ، لکھنؤ وغیرہ مقامات سے شایع ہونے والے طرحی رسالے نہیں گزرے۔ ان میں گجرات کے مختلف مقامات احمد آباد، بھڑوچ، سورت، بیرگام، بیتھاور، جوناگڈھ، راموں وغیرہ دور افتادہ شہروں اور چھوٹے گاؤں کے رؤسا، مدرس، پوسٹ مین، پولس کانسٹبل، کتاب فروش، گل فروش وغیرہ مختلف طبقے کے لوگوں اور پیشہ وروں کی غزلیں شایع ہوتی رہی ہیں۔ ان غزلوں کا ان رسالوں میں شایع ہونا ہی خود ان کے معیار کی ضمانت ہے، اس موضوع پر بھی تلاش و تفتیش سے مزید معلومات حاصل کرنے اور انہیں منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

مندرجہ بالا معروضات سے ثابت ہوتا ہے کہ گوجری زبان نویں صدی ہجری کے نصف اول میں جو بیجاپور میں شاہ میراں جیو شمس العشاق کے غالباً بچپن کا زمانہ تھا۔ صرف بول چال کی حد تک ہی نہیں بلکہ ایک ترقی یافتہ ادبی شکل اختیار کر چکی تھی اور اس عہد کے نمونوں کے پیش نظر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس کی ادبی تشکیل اس سے بھی کافی پہلے ہو چکی

تھی۔ اس موضوع پر مزید تلاش و تحقیق سے معلومات میں نہ صرف اضافہ ہو سکتا ہے بلکہ اردو ادب کی نشو و نما میں گجرات کا جو اہم حصہ رہا ہے اس سے اردو دنیا اچھی طرح سے روشناس ہو سکتی ہے۔

حوالے

[1] انگریزی رسالہ ایپیگرافیا انڈیکا عربک اینڈ پرشین سپلیمنٹ (کتبہ ہائے ہند کا عربی اور فارسی ضمیمہ) ۱۹۶۱ ص ۲۴-۱۰ انیز جرنل آف دی اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، مہاراجہ سایاجی راؤ یونیورسٹی، بڑودہ۔ اس کی کچھ تفصیلات کے لیے دیکھئے: سخنوران گجرات، از ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۰ء ص ۳۴-۳۲ [2] ایضاً ص ۱۹ تصویر ۶-۱ [3] اس کتاب کی افادیت اور مقبولیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تیسرا ایڈیشن اہم اضافوں کے بعد مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ کی جانب سے ۱۹۸۳ء میں اور اس کا گجراتی ایڈیشن بلساڑ، گجرات سے شایع ہوا [4] سخنوران گجرات: ص ۷، [5] مقالات شیرانی: مرتبہ مظہر محمود شیرانی، مجلس ادب لاہور جلد اول ۱۹۶۶ء، مقالہ "گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی عیسوی میں" ص ۲۰۰-۱۵۹ [6] اسلامک کلچر حیدرآباد جلد ۲۷/۲، ۱۹۵۳ء ص ۳۶-۱۸، اردو کراچی ۱۹۵۳ء [7] اس بات کا بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ خود حضرت قاضی محمود دریائی کے خاندان کے افراد اور مریدین بھی گوجری میں جکریاں کہتے تھے، مولوی عبدالحق اور حافظ محمود خاں شیرانی صاحب نے تو قاضی محمود دریائی کے ملفوظ مفتاح القلوب اور ان کے حالات پر مشتمل تصنیف تحفۃ القاری نہیں دیکھی لیکن ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی صاحب نے اپنی کتاب سخنوران گجرات میں تحفۃ القاری کا حوالہ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے مدنی صاحب نے اس کے نسخے کا بغور مطالعہ نہیں کیا، ان کتابوں میں کم از کم مذکور پانچ چھ حضرات کی گوجری زبان میں کہی ہوئی جکریاں موجود ہیں۔ ان کتابوں کے نسخے احمد آباد میں درگاہ

حضرت پیر محمد شاہ میں موجود ہیں اور تحفۃ القاری کا ایک نسخہ بمبئی کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتاب خانے میں بھی ہے۔ تحفۃ القاری کی اشاعت کا درگاہ حضرت پیر محمد شاہ ٹرسٹ کی جانب سے اہتمام ہو رہا ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ سال آئندہ کے اوائل میں اس کا مطبوعہ نسخہ منظر عام پر آجائے گا[۸] دیکھئے نوٹ نمبر ۹[۹] نوائے ادب بمبئی، جنوری اپریل ۱۹۵۱ء، وغیرہ [۱۰] لفظ جکری کو جگری یا دل سے نکلی ہوئی بات یا ذکری کی بگڑی ہوئی شکل بتایا گیا ہے۔ دیکھئے سخنوران گجرات ص ۵۰۔ ضیاء الدین ڈیسائی صاحب نے جمعات شاہیہ جلد ششم کے علی گڑھ نسخے میں اسکے املا چکڑی کا حوالہ دے کر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ "چکری" یعنی چکر (چرخ) سے ہے اور انہوں نے اس کو مولانا جلال الدین رومی کے WHIRLING DARWISHES کے نہج پر صوفیائے کرام کے حلقوں میں رقص کے ساتھ گائی جانے والی تالبدھ تصنیف بتایا ہے۔ دیکھئے شاہ بہار الدین باجن زندگی اور کلام۔ از ڈاکٹر شیخ فرید، مطبوعہ درگاہ شریف حضرت پیر محمد شاہ ٹرسٹ احمد آباد ۱۹۹۲ء مقدمہ ص ۱۸۔۴۴ [۱۱] حوالوں [۱۲] کے لیے دیکھئے: دیوان جلالی احمد آبادی، سید مقبول احمد رضوی (شاہی)، مرتبہ پروفیسر محی الدین بمبئی والا، مطبوعہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ ٹرسٹ، احمد آباد ۱۹۹۵ء ص ۱۶ INTRODUCTION BY DR. Z. A. DESAI [۱۲] دیکھئے معارف اکتوبر ۱۹۹۳ء [۱۳] ڈاکٹر سید اکبر علی ترمذی صاحب نے اپنے مضمون میں اس کا ذکر کیا ہے۔ نوائے ادب ممبئی جنوری، اپریل ۱۹۵۱ء۔

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

۳۰ جون ۱۹۹۷ء

مکرمی و محترمی، السلام علیکم

جون ۱۹۹۷ء کے معارف میں جناب گوردیال سنگھ مجذوب کا مضمون "لفظ کہف کا ہندوستانی ماخذ" نظر سے گزرا۔ اس میں تحریر کردہ دیگر امور سے قطع نظر جہاں تک حرف 'واو' کے حرف 'ف' میں تبدیل کیے جانے کا تعلق ہے اصلی صورت حال یہ ہے کہ عرب حرف W کو نہیں بلکہ صرف حرف V کو ف میں تبدیل کرتے ہیں اور اس کا مقصد W اور V کے درمیان امتیاز کرنا ہوتا ہے اسی لیے WAVELL میں W واو ہی رہا البتہ V ف ہو گیا یعنی عرب فیفل نہیں لکھتے ہیں، ولفل لکھتے ہیں۔ یہی معاملہ لفظ SHIVA کے ساتھ بھی ہے۔ مہادیو کو کبھی عربوں نے رومن رسم خط میں پڑھا ہوگا یعنی MAHADEV۔ اس لیے V کو ف میں تبدیل کر دیا۔ یہ بات کھوہ پر صادق نہیں آتی ہے۔ اس لیے کہف کی اصل کھوہ قرار دینا محض قیاس آرائی ہے۔ اسکے لیے مزید ثبوت درکار ہے۔

نیازمند

ریاض الرحمن شروانی

مکتوب دہلی

ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

۲۵ جون ۹۷ء

جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب گوردیال سنگھ مجذوب صاحب (معارف جون ۱۹۹۷ء ص ۴۵۹) فرماتے ہیں کہ عرب حرف "واو" کو "ف" میں بدل دیتے ہیں، جس کی انہوں نے "دیول" اور "شیوا" سے مثال دی ہے۔

یہ تبصرہ درحقیقت ایک غلط فہمی پر مبنی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ ہندوستان کے بہت سے عربی داں عربی لکھتے ہوئے اس غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ حرف "واو" کو "ف" میں بدلنے کا کلاسیکل عربی میں کوئی رواج نہیں ہے اور نہ ہی شاید اس کی کوئی پرانی مثال دی جاسکتی ہے۔ دراصل جب پچھلی دو صدیوں سے عربوں کو یوروپین زبانوں سے واسطہ پڑا اور انہیں یوروپین الفاظ عربی زبان میں لکھنے پڑے تو ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش آیا کہ "ڈبلیو" (W) و "وی" (V) کو صحیح طریقے سے کس طرح منتقل کیا جائے کہ پڑھنے والے جان جائیں کہ یہ W ہے یا V۔

یہ کام زیادہ تر مصر میں انجام پا رہا تھا اور وہاں کے خواص نے انگریزی سامراج کے تسلط کے خلاف خاموش احتجاج کے طور پر انگریزی کے بجائے فرانسیسی زبان یوروپ سے علمی تعلق قائم کرنے کے لیے اپنائی تھی۔ اس لیے فرانسیسیوں کی نقل کرتے ہوئے "V" کو "ف" کی طرح لکھا جانے لگا۔ (فرانسیسی "V" کو F کی طرح بولتے ہیں)۔ اس کی تقلید میں ہمارے بعض ہندوستانی عربی داں لوگوں نے ایسے ہندوستانی الفاظ کو جو انگریزی میں

"V" سے لکھے جاتے ہیں (مگر دراصل "W" کی طرح بولے جاتے ہیں) عربی میں "ف" سے لکھنا شروع کردیا مثلاً "شیوا" کے بجائے "شیفا"، جبکہ صحیح یہ تھا کہ اس کو "شیوا" ہی لکھا جائے تاکہ اگر عربی سے کسی اور زبان میں اس کا ترجمہ ہو تو SHIFA نہ ہو جائے۔

والسلام : ظفرالاسلام خان

مکتوب مدراس

۲۷ محرم ۱۴۱۸ھ / ۴ جون ۱۹۹۷ء

مدراس

محترم جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب! السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مارچ ۱۹۹۷ء کا "معارف" پیش نظر ہے، جناب توقیر احمد اعظمی ندوی علی گڑھ کے مضمون 'ہندوستان میں عربی سیرت نگاری' (صفحہ ۲۱۳-سطر ۸) میں تحریر ہے "شیخ احمد بن صبغۃ اللہ مدراسی کی "تاریخ احمد" قابل ذکر ہے"۔ تاریخ احمد کے متعلق تفصیل معلوم ہوجائے تو عین نوازش ہوگی۔

حاجی احمد بن مولانا صبغۃ اللہ امام العلماء قاضی بدرالدولہ کی ایک تالیف "تاریخ احمدی" بہ زبان فارسی خاندانی کتب خانہ میں موجود ہے، اس مخطوطہ میں صرف اہل عشرہ کا تذکرہ ہے۔

البتہ قاضی بدرالدولہ نے سیرت النبیؐ پر ایک ضخیم کتاب فوائد بدریہ ۱۲۵۵ھ میں تالیف کی تھی۔ پہلی طباعت ۱۲۶۳ھ میں ہوئی، غالباً زبان اردو میں سیرت النبیؐ پر پہلی کتاب ہے؟ یہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے کئی اڈیشن طبع ہوئے ہیں۔ پہلا باب جو نبی کریمؐ کی بعثت سے رحلت تک کے واقعات پر مشتمل ہے، انجمن اصلاح

العشیرہ حیدرآباد (اے۔پی) کی جانب سے ۱۴۱۷ھ میں طبع کیا گیا ہے۔

- قاضی بدرالدولہ (المتوفی ۱۲۸۰ھ) عالم اسلام کے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) کے دادا اور حاجی احمد (المتوفی ۱۳۰۷ھ) حقیقی چچا ہوتے ہیں۔

آپ کا مخلص

عبید اللہ (خریدار نمبر ۱۴۲۳ ۔S)

مکتوب لکھنؤ

لکھنؤ

۲۸ جون ۱۹۹۷ء

فاضل گرامی قدر جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب! زید مجدہٗ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

معارف کا تازہ شمارہ (جون) دیکھا، اس میں آپ نے دارالمصنفین کی بنیاد کس نے ڈالی کے عنوان سے ہماری قلمی لغزش پر تنبیہ کیا ہے، جزاکم اللہ حیرت ہے کہ کیسے یہ جملہ ہمارے قلم سے نکل گیا، اتنی بدیہی حقیقت ہماری نظروں سے اوجھل رہی، قلم کی لغزش ہی ہے اور کچھ نہیں ورنہ ہم سب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ علامہ شبلی ہی نے اسکی بنیاد ڈالی تھی، آپ سے دو سال کے اندر برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن آپ نے اس لغزش کی طرف ہمیں متوجہ نہیں فرمایا[1]، ورنہ اسی وقت اس غلطی کا ازالہ رسالہ میں شایع کرادیا جاتا۔ ہم ایک مراسلہ اڈیٹر نیا دور کو بھی لکھ رہے ہیں۔

والسلام

مخلص : نذرالحفیظ ندوی

---

[1] آپ کا مضمون نیا دور میں سرسری دیکھا تھا، اب ڈاکٹر ابرار اعظمی جو اردو کے اچھے شاعر و نقاد ہیں کے استفسار میں اس کی طرف توجہ ہوئی۔ "ض"

وفیات

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی

از جناب حافظ شاد احمد الحسینی صاحب

یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ۶ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۴ مئی ۱۹۹۷ء کو ممتاز عالم دین و مصنف مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی رحلت فرما گئے۔

قاضی صاحب کا خاندان علوم دینیہ کی خدمت میں مشہور ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت بازنگل مرحوم حضرت سید گیسو درازؒ کی اولاد سے تھے اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے قافلہ جہاد میں شامل تھے۔ بالاکوٹ کے سقوط کے بعد ہزارہ سے نقل مکانی کر کے پنجاب کے مشہور علمی خطہ علاقہ چھچھ کے موضع شمس آباد تشریف لے آئے۔ قاضی صاحبؒ کے دادا قاضی نادر دینؒ اپنے وقت میں پنجابی کے مشہور شاعر اور مصلح دین تھے۔ ان کے والد مولانا مفتی قاضی غلام جیلانی مرحوم مناظر اور صاحب قلم عالم دین تھے۔ تقریباً پچاس اصلاحی کتابیں لکھیں۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں خانقاہ موسیٰ زئی شریفؒ کے سجادہ نشین حضرت مولانا سراج الدینؒ سے مجاز طریقت تھے۔ متنبی قادیان مرزا قادیانی کا مقابلہ تحریر و تقریر اور مناظرہ سے کیا۔ "تیغ غلام جیلانی برگردن قادیانی" آپ کی مشہور تصنیف ہے ۱۹۲۸ء میں اپنے آبائی گاؤں شمس آباد میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی ۶ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ مطابق یکم فروری ۱۹۱۳ء بروز ہفتہ پیدا ہوئے، قرآن پاک اور ابتدائی عربی فارسی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی، ۱۹۲۶ء میں شمس آباد سے مڈل پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں آپ منیتہ المصلی اور ہدایت النحو وغیرہ ابتدائی کتابیں

پڑھ رہے تھے کہ والد گرامی کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ لیکن داغ یتیمی آپ کے شوق اور حصول علم کی ہمت کو کم نہ کر سکا۔ علاقہ چھچھ میں اس وقت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا عبدالحئی لکھنوی کے تلامذہ موجود تھے ان سے تحصیل علم کرنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور وہاں کے جید اساتذہ سے استفادہ فرمایا، پھر محدث العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری سے استفادہ کے لیے ڈابھیل تشریف لے گئے، طالب علمی ہی کے زمانے میں فلسفہ کی مشہور کتاب صدرا کی شرح البدر الحل الصدرا لکھی جس کی تحسین حضرت مدنی نے بھی فرمائی ہے۔

"یہ کتاب خدا کے فضل وکرم اور مولف کی عرق ریزی اور کمالات علمیہ کی وجہ سے مستقل کتاب اور صدرا کی شرح بن گئی ہے، مجھ کو قوی امید ہے کہ اس کتاب سے شائقین علوم عقلیہ کو بہت زیادہ فائدہ پہنچے گا"

۱۹۳۲ء میں دار العلوم دیوبند کے دورہ حدیث شریف میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے بخاری اور ترمذی پڑھی، حضرت مدنی کی اردو تقریر کو آپ دوران سبق ہی عربی میں قلمبند فرماتے رہے۔ مسلم شریف مولانا رسول خان ہزاروی سے، ابوداؤد شریف مولانا میاں اصغر حسین سے، طحاوی شریف مولانا محمد ابراہیم بلیاوی سے، شمائل ترمذی مولانا اعزاز علی سے اور موطا امام محمد مفتی محمد شفیع سے پڑھی۔

آپ کے دور طالب علمی میں ایک مرتبہ مشہور شاعر اور زمیندار کے اڈیٹر مولانا ظفر علی خان دار العلوم دیوبند تشریف لائے، ان کے اعزاز میں دار الحدیث میں تقریب استقبالیہ منعقد ہوئی۔ اساتذہ اور طلبا نے نظم ونثر میں انہیں خوش آمدید کہا۔ اس موقع پر قاضی صاحب نے اپنی نظم میں مرزا قادیانی کے خلاف اکابر دیوبند کی خدمات کا

تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ع انہی کی ذات اقدس سے بشیر الدین نالاں ہے۔

اس نظم سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خان نے فی البدیہ دیوبند کی شان میں مشہور نظم کہی جس کا پہلا شعر مندرجہ ذیل ہے:

شاد باد و شاد زی اے سرزمین دیوبند — ہند میں تو نے کیا اسلام کا پرچم بلند

صوفیانہ مسلک: قیام سہارنپور کے زمانہ میں حضرت مدنی سے عقیدت پیدا ہوگئی جو بالآخر حضرت مدنی کے دامن فیض سے وابستگی کا سبب بنی، حضرت قاضی صاحب خود اس کی تفصیل میں فرماتے ہیں:

"حضرت (مدنی) کانگرس یا جمعیت العلماء کی دعوت پر سہارنپور تشریف لاتے اور فرودگاہ میں تقریر فرماتے۔ اسی وقت سے آئینہ دل میں حضرت کا نقش اسی طرح ثبت ہوگیا کہ آج تک باقی ہے اور انشاء اللہ باقی رہے گا۔ مگر زیادہ قرب دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے داخلہ پر نصیب ہوا۔ کئی بار (بیعت کی) درخواست کی مگر یہی جواب ملا کہ استخارہ کر لیا جائے۔ ایک رات سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بیعت کا حکم ملا۔ وہ پورا خواب لکھ کر ارسال کر دیا تو جواب فرمایا کہ ملاقات پر انشاء اللہ بیعت کر لی جائے گی۔ آخر وہ سعادت آفرین گھڑی آگئی کہ مورخہ ۲۶ شعبان ۱۳۵۵ھ/ ۱۳ نومبر ۳۶ء بروز جمعرات نماز مغرب کے بعد اسی مسجد میں چند دیگر سعادت مندوں کے ساتھ بیعت کا شرف حاصل ہوگیا۔"

قاضی صاحب کی باطنی ترقیات دیکھ کر حضرت مدنی نے سلسلۂ چشتیہ کے اذکار و اشغال کی تلقین کی اجازت عنایت فرما دی۔

۱۹۳۶ء میں جب حضرت مدنی کی زیارت کے لیے دیوبند تشریف لے گئے تو وہاں سے

واپسی پر حضرت مدنی نے حضرت[1] لاہوری کے نام آپ کو دستی رقعہ عنایت فرمایا۔ جس میں آپ کے متعلق بھی ایک جملہ لکھا "علمی اور عملی حالت ماشاء اللہ قابلِ اطمینان ہے"۔ اب حضرت لاہوری کے ہاں بھی آپ کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ ۱۹۳۱ء میں جب پہلی مرتبہ حج بیت اللہ کو جارہے تھے تو حضرت لاہوری نے آپ کو اپنے قلمی دستخطوں سے مزین اپنا ترجمۂ قرآن پاک عنایت فرمایا، یہ محض ایک تحفہ نہ تھا بلکہ حضرت لاہوری نے بقول آپ کے اپنا فیضِ قرآنی آپ کو منتقل فرمادیا۔ ۱۹۶۱ء میں جب حضرت لاہوری ایبٹ آباد تشریف لائے تو از خود فرمایا "میں چاہتا ہوں کہ سلسلۂ قادریہ میں آپ کی تکمیل کرا دوں"۔ ابتدائی اسباق بھی تلقین فرمائے۔ ۱۵ مئی ۱۹۶۱ء ایبٹ آباد تشریف آوری پر آپ کو اپنا مجاز فرمایا۔

حضرت لاہوری نے آپ کی تصنیف معارف القرآن کی تقریظ میں لکھا "محترم المقام حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب موجودہ دور کے ان علمائے کرام میں سے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے کتاب و سنت کے سمجھنے کے لیے ایک خصوصی ملکہ عطا فرمایا ہے"۔

تدریسی خدمات: دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۳۲ء میں اپنے آبائی گاؤں شمس آباد میں "مدرسہ محمدیہ" کی بنیاد رکھی جس میں طلبہ دور دور سے آتے تھے۔ یہاں آپ نے بخاری سے لے کر کافیہ تک علوم و فنون کی تمام کتب پڑھائیں، تعلیم و تدریس کے ساتھ علاقہ کی مذہبی ضروریات کا خیال رکھا۔ ۱۹۳۵ء میں کامرہ میں مشہور شیعہ مناظر شبیر احمد فاضل لکھنؤ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صداقت پر مناظرہ کیا اور اسے شکست فاش دی۔ ۱۹۴۱ء میں مولانا اعزاز علی کے فرمانے پر ڈلوال ضلع

[1] معارف: غالباً مولانا احمد علی لاہوری مفسر قرآن مراد ہیں۔

جہلم تشریف لے گئے اور قادیانیوں کے خلاف سرگرم عمل رہے۔ ۱۹۴۹ء میں اٹک کی جامع مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دیے اسی دوران جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک میں بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھائی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ارشاد پر ۱۹۵۱ء میں اٹک کالج میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہوئے اور ۱۹۶۷ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں مدینہ مسجد کی بنیاد رکھی تھی، ریٹائرڈ ہونے کے بعد زندگی کی آخری ساعتوں تک یہیں مدینہ مسجد میں علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت اور تصوف و سلوک کی خدمت اور مخلوقِ خدا کی رہنمائی فرمائی۔

درس قرآن مجید سے خصوصی شغف: دوسرے علمائے دیوبند کی طرح قاضی صاحب کو بھی قرآن مجید سے شغف تھا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر متعدد کتابیں مرتب فرمائیں، درس قرآن مجید معمول بن گیا تھا، اس میں کبھی ناغہ نہ ہوتا، ایبٹ آباد کے قیام میں دن میں تین تین مقامات پر عرصہ تک درس دیتے رہے۔

تنظیمی اور ملی خدمات: گو آپ کا خاص مشغلہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور ارشاد و ہدایت تھا تاہم قومی و ملی مسائل سے بھی یک گونہ سروکار رکھتے۔ ۳۳۲ھ میں جمعیت علمائے اٹک کی بنیاد رکھی۔ جس نے گرانقدر دینی خدمات انجام دیں۔ بعض مذہبی مسائل پر علماء کے اختلاف رائے کی وجہ سے مذہبی انتشار پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کے لیے آپ نے مجلس تنقیح فتویٰ قائم کی اور علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔

۱۹۴۷ء میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کے زیر صدارت ایک اسلامی کانفرنس ہوئی جس میں آپ نے پورا حصہ لیا۔ دوسری دینی و ملی تنظیموں میں بھی حصہ لیا اور مختلف وقتوں میں ہفتہ وار اخبار اور رسالے بھی نکالے۔

تصنیفی خدمات: اللہ تعالیٰ نے آپ کو تحریر و تصنیف کا ملکہ بھی عنایت فرمایا تھا اور آپ کا ذوق بڑا متنوع تھا اس لیے مختلف موضوعات پر درجنوں چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔

۱۵ اگست ۱۹۸۹ء کو آپ کو دل کا شدید دورہ پڑا دوبارہ پھر پڑا اور ڈاکٹروں کی ممانعت کے باوجود علمی و عملی اشغال کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بالآخر وقت موعود آگیا اور عین تہجد کے وقت ڈیڑھ سوا دو بجے تین مرتبہ اللہ اللہ اللہ فرمایا اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

اولاد: اللہ تعالیٰ نے آپ کو تین بیٹے اور چار بیٹیاں عنایت فرمائیں۔ سب آپ کے حسن تربیت سے نیک صالح، متقی پرہیزگار اور حافظ و قاری اور عالم فاضل ہیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا قاضی محمد ارشد الحسینی جامعہ اشرفیہ سے فاضل ہیں، منجھلے صاحبزادے مولانا قاضی محمد راشد الحسینی اور چھوٹے صاحبزادے مولانا قاضی محمد ابراہیم ثاقب الحسینی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے فاضل ہیں۔

تیرہ ۱۳ خوش نصیبوں کو آپ نے اپنا مجاز فرمایا جن کے اسم گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ مولانا صاحبزادہ قاضی محمد ارشد الحسینی اٹک ۲۔ مولانا ڈاکٹر سید سعید اللہ جان پشاور ۳۔ مولانا قاری محمد سلیمان ٹیکسلا ۴۔ مولانا محمد زمان بنوں ۵۔ جناب کرنل محمد جمیل کرک کوہاٹ ۶۔ مولانا مفتی محمد حسین شورکوٹ ۷۔ حافظ نثار احمد الحسینی حضرو، ۸۔ حاجی عبدالعزیز ایبٹ آباد ۹۔ صاحبزادہ مولانا قاضی محمد راشد الحسینی اٹک ۱۰۔ صاحبزادہ مولانا محمد ابراہیم ثاقب الحسینی اٹک ۱۱۔ مولانا قاری غلام نبی افغانی ۱۲۔ حافظ عطاء اللہ دہاڑی ۱۳۔ مولانا قاری محمد ادریس اسلام آباد۔

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری

از ضیاء الدین اصلاحی

مئی کے آخر یا جون کے شروع میں جناب شوکت حسین کینگ مدیر ماہنامہ الاعتقاد سری نگر کے ایک مکتوب سے یہ معلوم کرکے بڑا دکھ اور سخت افسوس ہوا کہ ریاست کشمیر کے مشہور صاحب علم و قلم پروفیسر ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری طویل علالت کے بعد ۱۹ ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ / ۲۷ اپریل ۱۹۹۶ء کو رحلت فرما گئے، یہ اطلاع خود ہی تاخیر سے ملی تھی اور باوجود کوشش کے جون کے معارف میں ان پر نوٹ شایع کرنے کی گنجایش نہیں نکلی۔

بخاری صاحب کی عمر ابھی زیادہ نہ تھی اور ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر موت کا وقت معین ہے، اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی، فاروق صاحب ۲۷ جون ۱۹۴۹ء کو پیدا ہوئے تھے، ان کا خاندان علمی، دینی اور روحانی فضیلت کا حامل تھا، ان کے والد بزرگوار مولانا سید محمد قاسم بخاری کو جو ابھی خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ موصوف انجمن تبلیغ الاسلام جموں و کشمیر کے صدر اور حنفی عربی کالج سری نگر کے بانی مہتمم ہیں، کشمیر کے اس بخاری خانوادے کا نسبی سلسلہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

ڈاکٹر مولوی فاروق بخاری کی تعلیم کی ابتدا کشمیر میں ہوئی اور کشمیر یونیورسٹی ہی سے انہوں نے مولوی فاضل کیا، لیکن عربی میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ موصوف کا خاص مشغلہ درس و تدریس

تھا اور اب وہ امر سنگھ کالج سری نگر میں شعبۂ عربی کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ تھے۔

لیکن تصنیف و تالیف کا بھی ان کو اچھا ملکہ تھا، کشمیر کی علمی، ادبی، ثقافتی اور مذہبی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا اور اس پر ان کا مطالعہ وسیع تھا، اس موضوع اور اس کے متعلقات پر ان کے مضامین برابر شایع ہوتے تھے اور حسب ذیل کتابیں بھی شایع ہوئیں۔

۱۔ کشمیر میں اسلام کی اشاعت ۲۔ کشمیر میں عربی شعر و ادب کی تاریخ ۔ ۳۔ کشمیر میں عربی علوم کی اشاعت ۴۔ کشمیر میں اسلامی ثقافت کے تاریخی مراحل ۔

ان میں سے بعض کتابیں راقم کی نظر سے گزری ہیں جن سے مصنف کی تلاش، محنت اور تحقیق کے علاوہ موضوع پر ان کی اچھی دسترس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں :۔

۵۔ البصائر ۶۔ سیرت شیخ نجم الدین احمد الکبریٰؒ ۷۔ سیرت حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ ۸۔ سیرت حضرت میر محمد ہمدانیؒ ۹۔ سیرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ ۱۰۔ علامہ انور شاہ اور ان کے تذکرہ نگار ۱۱۔ دینیات دو حصے ۔

کشمیر کی طرح تصوف بھی ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھا۔

ڈاکٹر صاحب دار المصنفین کے بڑے قدر داں تھے، اس کی مطبوعات آرڈر دے کر منگاتے تھے، معارف بھی شوق اور پابندی سے پڑھتے تھے اور ایک عرصہ سے اس میں ان کے مضامین بھی چھپتے تھے۔ وہ دینی حمیت اور اسلامی جذبہ سے سرشار تھے جس کا اندازہ ان کی تحریروں سے ہوتا تھا۔ کشمیر کے موجودہ حالات

سے بڑے شکستہ خاطر رہتے تھے، چند برس پہلے انھوں نے اس کے متعلق ایک طویل اور غمناک خط بھی مجھ کو لکھا تھا جو معارف میں شایع ہوا تھا۔ راقم سے اکثر خط و کتابت رہتی تھی، ادھر عرصہ سے ان کا کوئی خط نہیں آرہا تھا جس کی وجہ سے بڑی خلش تھی، کئی بار خیال ہوا کہ میں خود خط لکھ کر مزاج پرسی کروں اور مضمون کی فرمایش کروں، مگر اس کی نوبت نہیں آئی اور وہ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت کاملہ سے نوازے اور اعزہ و متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین ۔ "ض"

پنڈت آنند نرائن ملا

۱۲ جون کو اردو تحریک کے قائد پنڈت آنند نرائن ملا چل بسے، ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے، جہاں ان کے والد پنڈت جگت نرائن ملا چوٹی کے وکیل تھے، آنند نرائن ملا بھی تعلیم سے فارغ ہو کر وکالت کے پیشہ سے وابستہ ہوئے، پھر الہ آباد ہائی کورٹ کے جج اور سینیئر جسٹس ہوئے ۱۹۶۱ء میں ریٹائر ہوئے تو سپریم کورٹ میں وکالت شروع کی، لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ممبر بھی منتخب ہوئے لیکن ان کی اصل شہرت و امتیاز کا باعث یہ ہے کہ اردو کے ایک بڑے شاعر، نقاد، ادیب، سیکولر، انسان دوست اور گنگا جمنی تہذیب کا نمونہ تھے، اردو کی محبت ان کے رگ و پے میں رچی بسی ہوئی تھی اور وہ اسکے اپنی مادری زبان ہونے پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن مادری زبان نہیں چھوڑ سکتا"، ان کا شعر ہے :

آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو   اک آخری گیت گا لیں تو چلیں

منظوم تصنیفات کے علاوہ بعض نثری تصنیفات بھی یادگار ہیں، نظم و غزل دونوں پر قدرت تھی، روایت کی پاسداری کے باوجود کلام میں فرسودگی نہیں، مشاعرہ کے شاعر نہ تھے مگر اس میں شرکت کرتے تھے، دار المصنفین کی گولڈن جبلی کے مشاعرہ کی صدارت کی تھی۔ اب غیر مسلموں میں اردو کے ایسے عالم، دانشور اور اس سے گہرا لگاؤ رکھنے والے عنقا ہوگئے ہیں، اس اعتبار سے انکی وفات اردو کا واقعی ناقابل تلافی نقصان ہے۔ "ض"

مطبوعات جدیدہ

کاروانِ زندگی

حصہ ششم

از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۳۰۹، مجلد مع گردپوش قیمت تحریر نہیں، ناشر: مکتبہ اسلام ۱۷،۲/۵۴، محمد علی لین، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ "کاروانِ زندگی" کے نام سے اپنی پُر از معلومات "آپ بیتی" لکھ رہے ہیں، یہ اس کا چھٹا حصہ ہے جو ۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۶ء کی سرگزشت ہے، اس میں ملک و بیرونِ ملک مولانا کے اسفارِ دینی، دعوتی، قومی، ملی، تصنیفی و تحریری اور دوسری گوناگوں اور مختلف النوع سرگرمیوں کا تذکرہ ہے، مولانا کی بین الاقوامی شخصیت کا دائرۂ عمل ہندوستان اور عالم اسلام ہی نہیں یورپ و امریکہ تک وسیع ہے، ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے علاوہ اس عرصہ میں جہاں جہاں جانے اور وہاں تبادلۂ خیال اور خطاب کا موقع ملا اس کی روداد بیان کی گئی ہے۔ جیسے حجاز، وجدہ، سوڈان، دوحہ (قطر) قاہرہ، استنبول، لندن اور دبی۔ حجاز مقدس کئی بار جانا ہوا اور آخری بار کے سفر میں کلید کعبہ مولانا کو سپرد کی گئی اور در کعبہ کھولنے کا شرف حاصل ہوا، استنبول میں رابطۂ ادب اسلامی کے جلسہ میں شرکت کے لیے گئے تو وہاں کے قدردانوں نے آپ کی شخصیت اور کمالات پر ایک سمینار کیا، مولانا کا اصل تعلق دار العلوم ندوۃ العلماء سے ہے اور ان کا زیادہ وقت یہیں بسر ہوتا ہے، کتاب کی ابتدا ندوہ کے اہتمام کے نئے انتخاب کے ذکر سے ہوئی ہے، دوسرا اہم واقعہ ندوہ پر پولیس کے شب خوں کا ہے،

جو مولانا کے لیے نہایت روح فرسا اور جاں گسل تھا اور جس کا ہندوستان اور دنیائے اسلام میں شدید ردعمل ہوا، اس کی اور اس سے متعلق دوسری ضروری باتیں بھی حیطۂ تحریر میں آگئی ہے، ندوہ میں رواقِ عبدالحئی کے افتتاح اور اس کے جلسۂ انتظامی میں خطاب اور علامہ یوسف القرضاوی کی ندوہ میں تشریف آوری اور ان کے داعیانہ خطبوں کا ذکر بھی ہے۔ مولانا رابطۂ ادب اسلامی، دینی تعلیمی کونسل، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، تحریکِ پیامِ انسانیت اور دوسرے کئی اداروں کے صدر ہیں اور شروع ہی سے رابطۂ عالم اسلامی کے باوقار رکن ہیں، ان سب کی سرگرمیوں اور ان کے جلسوں میں مولانا کی وقت اور موقع کے مناسب تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات دیے گئے ہیں، دوسری کانفرنسوں، سمیناروں، اصلاحِ معاشرہ کے جلسوں اور علمی و تعلیمی اجتماعات کی روداد بھی درج ہے۔ گزشتہ تین سال کے اندر جن عزیزوں، اہل تعلق یا علمی و دینی حیثیت سے ممتاز اشخاص کی وفات ہوئی ہے، مولانا کے طاقت ور قلم نے ان کے نمایاں خط و خال بیان کرکے انہیں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ مگر اس میں مولانا بدر الدین اصلاحی ناظم مدرسۃ الاصلاح کا ذکر رہ گیا ہے۔ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں مدیر الاعتصام لکھا ہے، یہ غالباً سہو قلم ہے، وہ المنبر کے مدیر تھے۔ مولانا کی طبیعت میں دردمندی ہے۔ مگر وہ مسلمانوں کی زبوں حالی، بے راہ روی، اخلاقی و معاشرتی پستی، مذہب سے انحراف اور جاہلانہ رسوم و عادات اختیار کرلینے ہی پر متفکر اور دل گیر نہیں ہیں بلکہ ملک کے اخلاقی، علمی اور روحانی زوال، اس میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت و فسطائیت، تشدد پسندی، خودغرضی، رشوت اور بدعنوانی پر بھی اشکبار ہیں۔ ان کی نظر نہ صرف ہندوستان اور اپنے صوبہ کے حالات پر ہے بلکہ دنیائے اسلام کے

واقعات سے بھی بے خبر نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان کے انتخابات اور اترپردیش میں حکومتوں کے عزل و نصب، فیروز آباد کے بھیانک ریلوے حادثہ کی طرح عالمی حوادث کا بھی ایک ماہر مورخ اور مبصر کی حیثیت سے تذکرہ کرتے ہیں۔ قوم و ملک کے ابتر حالات کو درست کرنے کے لیے ہندوستانی وزیر اعظم دیوگوڑا اور ترکی وزیر اعظم نجم الدین اربکان کو خطوط لکھتے ہیں، مولانا کو سب سے زیادہ تشویش دو باتوں کی ہے، ایک تو یہودی سازش و شطارت جو امریکہ کے بل پر عالم اسلام کو تہہ و بالا کیے ہوئے ہے، دوسری ہندوستان میں ہندو احیائیت کا فروغ جو مسلمانوں کی نسل کشی اور ان کے ارتداد کے لیے منظم جدوجہد کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ جا بجا مولانا نے مسلمانوں کو اصلاحِ حال اور فریضۂ احتسابِ کائنات کا درس دیا ہے غرض یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز اور پڑھنے اور سبق حاصل کرنے کے لائق ہے، اللہ تعالیٰ آگے کی جلدوں کو مکمل کرنے کے لیے مصنف کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے۔ آمین۔

مباحث القرآن مرتبہ مولانا عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی، جامعی، تقطیع متوسط، کتابت ٹائپ، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۱۳۰، قیمت ۳۵ روپے، پتہ: دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڈھ، یو۔ پی۔

مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم مولانا حمید الدین فراہیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ان کی زندگی درس و تدریس اور مدرسۃ الاصلاح کی خدمت میں بسر ہوئی اور انکو تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں ملا تاہم اپنے رفیقِ درس مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے اصرار پر ماہنامہ الاصلاح کے لیے بعض مضامین تحریر کیے تھے، جو ان کے رسوخ فی العلم اور قرآن مجید کے فہم اور اس میں وسعت نظر کے علاوہ اس کا بھی ثبوت تھا کہ اگر وہ تحریر و تصنیف کے میدان کا رخ کرتے تو اچھے اہلِ قلم ہوتے۔

اب مولانا کے عزیز شاگرد مولانا عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی جامعی نے ان مضامین کو یکجا کر کے شایع کیا ہے، پہلے مضمون میں حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلَوٰةِ الْوُسْطَىٰ الخ (بقرہ) کا ماقبل و مابعد سے تعلق واضح کرنے کے لیے سورہ کے مطالب کا عالمانہ تجزیہ اور پورے نظام پر بڑی لطیف و دل آویز بحث کی ہے، دوسرے میں وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَّلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ الخ (حج) کی بعض غلط تاویلوں کی تردید اور سیاق و سباق اور نظائر کی روشنی میں صحیح تاویل بیان کی گئی ہے، تیسرا مضمون مشہور منکر حدیث چودھری غلام احمد پرویز کے اس خیال کی مدلل تردید ہے کہ "مسلمانوں میں رائج تصورِ نجات یکسر غیر قرآنی ہے"۔ آخری مضمون میں استکبار کو ام المعاصی بتا کر اس کے تباہ کن اثرات و نتائج دکھائے ہیں۔ یہ سارے مضامین قرآنی حقائق و بصائر پر مشتمل ہونے کی بنا پر اہل علم اور قرآنِ مجید کے شیدائیوں کے لیے ایک قیمتی سوغات ہیں، ان کی اشاعت ایک مفید علمی و قرآنی خدمت ہے، اگر آیات و احادیث کی تخریج اور ان تفسیری اقوال کے حوالے دے دیے جاتے جو مولانا نے جا بجا نقل کیے ہیں تو مجموعہ کا فائدہ بڑھ جاتا۔ آخری مضمون مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی مرحوم کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ فاران بجنور میں شایع ہوا تھا، اس کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔

تحدیث نعمت مرتبہ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۵۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰ روپے، پتے: (۱) الفرقان بکڈپو ۱۱۴/۳۱ نظیر آباد، لکھنؤ۔ (۲) فرقان پبلیکیشنز ۹۰۔ بی۔ ہنلے روڈ۔ لندن۔

یہ کتاب مولانا محمد منظور نعمانی مرحوم کی آپ بیتی ہے لیکن اس کی نوعیت اس طرح کی دوسری کتابوں سے مختلف ہے، اس میں قرآن مجید کے ارشاد وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کے بموجب

مولانا نے اپنے اوپر اللہ کے علمی، عملی اور دینی احسانات کی تفصیل قلمبند کی ہے جو دو طرح کے ہیں اور اسی لحاظ سے یہ کتاب بھی دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے کا عنوان نعمتِ علم اور توفیقِ عمل ہے اور دوسرے کا بندگانِ حق کی یافت، پہلے میں ان انعاماتِ خداوندی کا ذکر ہے کہ مولانا ایک خوشحال دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، دینی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے، دارالعلوم دیوبند کے ممتاز و فائق اساتذہ سے تحصیلِ علم کی سعادت میسر آئی جن میں سرِ فہرست مولانا انور شاہ کشمیری تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد احقاقِ حق و ابطالِ باطل کی خدمت انجام دی، ماہنامہ الفرقان جاری کیا جس کے ذریعہ دین کی اشاعت کی اور اس کے متعدد اہم اور خاص نمبر نکالے، جماعت اسلامی کی تاسیس میں شریک ہوئے، مگر انکے بقول فکر و نظر کی اس غلطی سے واپسی کے لیے بالکل ابتدائی مرحلے ہی میں توفیق الٰہی نے دستگیری کی اور مولانا محمد الیاس کی خدمت میں رسائی ہوئی اور الفرقان تبلیغی تحریک کا نقیب بن گیا، تقسیم ملک کے بعد بہت سے دینی و ملی کام انجام دیے، رابطۂ عالم اسلامی کی ممبری کے طفیل میں حرمین شریفین میں بار بار حاضری ہوئی، مسلمانوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے بہت سے کتب و رسائل تصنیف کیے، دوسرے حصہ میں جن بندگانِ حق اور خاصانِ خدا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور انکے جو واقعات مولانا کے مشاہدہ میں آئے یا انکی سیرت و شخصیت کے جو نمایاں جوہر سامنے آئے اور انکی تعلیم و ارشاد اور اصلاحِ خلق کے جو مفید انداز دیکھے ان سب کو بڑے اچھے اور موثر انداز میں پیش کیا ہے، یہ حصہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، مولانا محمد زکریا، مولانا شاہ وصی اللہ، مولانا حسین علی شاہ مجددی، حاجی عبدالغفور جودھپوری کی روح پرور صحبتوں کے حال، ان کی زندگیوں کے خط و خال اور ان کے ممتاز اوصاف و خصوصیات پر مشتمل ہے اس کتاب سے موجودہ صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کی بعض علمی و دینی سرگرمیوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ مولانا کے حسنِ بیان اور دلکش و دلآویز تحریر کا نمونہ بھی ہے۔

"ض"